

پاکستان اقلیتوں کا مقتل

آنسہ قراۃ العین تاج

فہرست

میں نے یہ کتاب کیوں لکھی؟؟

میرا بچپن وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں گذرا ۔والدین نے بچپن سے ہی سوال پوچھنے کا عادی بنایا کہ جب اور جہاں سمجھ میں باتیں نہ آئیں پوچھا کرو اور جب بھی سوال کیا والد صاحب نے بہت سکون سے سمجھایا جس سے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی ہوئی۔گھر کے پاس ہی ایک سرکاری سکول میں تعلیم حاصل کی۔ہمارے پڑوس میں ایک آنٹی رہتی تھیں جو قادیانی مذہب سے تعلق رکھتی تھیں پورا محلہ ان سے دور رہتا مگر انسانیت کے ناطے میرے والد صاحب کا حکم تھا کہ ان کا ہر کام کرنا ہے جس کے سبب ہمارا ان کے گھر آنا جانا بھی رہتا چونکہ وہ ایک سرکاری سکول میں عربی کی استاد تھیں تو ہمارے اسکول کی عربی کی ٹیچرز کا بھی آنٹی کے ہاں آنا جانا ہوتا ہمارے اسکول کی مس ساجدہ کو معلوم تھا کہ میں بھی آنٹی کے گھر آتی ہوں اس لئے انہوں نے پورے اسکول میں یہ مشہور کر دیا کہ اس لڑکی سے دور رہو یہ قادیانی مذہب کی ہے ایک مرتبہ میری کلاس ٹیچر نے قرآن خوانی کے دوران مجھے سپارہ پڑھنے سے منع کر دیا میں بہت شرمندہ ہوئی کہ میں نے کون سا گناہ کیا ہے جو نہ پڑھوں خیر میں نے ہمت کی اور سوال کیا کہ میں کیوں نہ پڑھوں تو مس نے پوری کلاس کے سامنے کہا کیونکہ "تم قادیانی ہو" یہ جملہ جب کلاس نے سنا تو سب نے مجھے ایسے گھورا جیسے میں اچھوت ہوں غصہ کو قابو کرتے ہوئے میں نے ٹیچر سے کہا آپ یہ ثابت تو کریں پہلے کہ میں قادیانی ہوں ان کے الفاظ تھے کہ مس ساجدہ نے بتایا ہے میں فوراً سمجھ گئی اور کہا کہ جن کے گھر جانے سے میں قادیانی بن گئی ہوں مس ساجدہ بھی وہاں جاتی ہیں وہ کیا ہوئیں پھر؟ خیر گھر آکر ابو کو بتایا انہوں نے پرنسپل کو شکایت کی تو کلاس ٹیچر نے آئندہ مجھے کبھی نہیں ٹوکا۔مگر میرے ذہن میں یہ واقعہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گیا۔جب صحافت کے میدان میں

قدم رکھا تو جگہ جگہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کو تکلیف دہ رویوں کو برداشت کرتے دیکھا جس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ پاکستانی پرچم میں سفید رنگ آخر اقلیت کی علامت ہے یا نفرت کی؟ کیا پاکستان کے وجود میں آنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم اقلیتوں کو کم تر درجہ دیں؟ آخر یہ آزادی صرف ہم مسلمانوں کا حق ہی کیوں؟ کیا دیگر مذاہب کو یہاں کھل کر جینے کی آزادی کبھی مل پائے گی؟ کیا اقلیتوں کو کوئی بھی جب چاہے گا قتل کر کے بری ہو جائے گا؟ کیا ہمارا دین مذہب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم اقلیتوں کے لیے زمین اتنی تنگ کر دیں کہ وہ خود کہیں چلے جائیں؟ کیا اسلام کی نام لیوا تحاریک صرف اپنے مفاد کے لئے ملک میں فساد برپا کر رہی ہیں؟ بہت سے سوالات ہیں جن کا جواب میرے پاس تو نہیں شائد میری یہ ادنی سی کاوش پڑھ کر آپ سمجھ سکیں کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے ہیں۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے اور ہمیں انسان اور انسانیت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔



دعا گو

آنسہ قراۃ العین تاج

پاکستان اقلیتوں کا مقتل

پڑھنے والوں کو ممکن ہے کہ یہ عنوان کچھ عجیب سا لگے اور ہوسکتا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر ناراض ہو کر مجھے اسلام دشمن، غدار وطن اور غیر ملکی این جی اوز ایجنٹ وغیرہ کہہ کر قابل گردن بھی زدنی قرار دے دیں کیونکہ ریاستی بیانیہ انہیں کچھ اور کہانی سناتا ہے، ریاستی بیانیے کے مطابق پاکستان ایک ایسی اسلامی جمہوریہ ہے جس میں آئین سب سے مقدس دستاویز ہے اور کسی کو اس کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ غدار کہلائے گا اور اس جرم میں اسے موت کی سزا دی جائے گی، آئین میں یہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ بلاتفریق مذہب، عقیدہ، رنگ ونسل اور زبان تمام پاکستانی شہریوں کے حقوق برابر ہیں یعنی مسلمان اکثریت کو غیر مسلم پاکستانی اقلیتوں پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ یہ وہ مثالی نقشہ ہے جو ریاست کے پالیسی ساز اور جغرافیائی کے ساتھ ساتھ اب بزعم خود نظریاتی سرحدوں کے محافظ ہر سطح اور فورم پر کھینچتے نظر آتے ہیں، اسے جھٹلانے کا مطلب ہے کہ آپ گئے، کہاں گئے؟ اس کا پتہ نہیں چلتا، اگر آپ نے بروقت خطرے کی بو سونگھ لی اور بھاگ نکلے، تب بھی آپ کا گرم تعاقب کیا جائے گا، ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ دنیا کے محفوظ ترین معاشروں میں بھی ایسے لوگوں کو تحفظ نہ مل سکا اور انہیں ناکردہ گناہ کی سزا دے دی گئی، یہی سبب ہے کہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی لوگ یہ تاثر دینے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے کچھ نہیں دیکھا۔

پاکستان میرا وطن ہے، میرا خمیر اسی خاک سے اٹھا ہے، مجھے اس سے بے پناہ محبت ہے مگر یہاں اسلام اور جمہوریت کے نام پر ملکی مفاد کی آڑ میں انسانیت کا جو مذاق اڑایا جارہا ہے وہ بحیثیت انسان میرے لئے بہت تکلیف دہ اور ناقابل برداشت ہے، مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ ریاست شدت پسندی کے واحد ستون پر کھڑی ہے، باقی تین ستون یعنی مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ صرف دھوکہ

ہیں، رہ گئی صحافت جسے ریاست کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے تو اس پر بھی اب سیٹھوں کا قبضہ ہے، رہے نام اللہ کا، نتائج سے بے پروا کچھ اہل قلم آج بھی ضمیر کا سودہ کرنے پر تیار نہیں، بقول رانا سعید دوشی میرا کرب یہ ہے کہ میں چپ رہا تو مجھے مار دے گا میرا ضمیر گواہی دی تو عدالت میں مارا جاں گا مجھے دونوں صورتیں قبول نہ ہوئیں لہذا خود ساختہ جلاوطنی اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، کتاب لکھنے کا مقصد صرف اور صرف اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پالیسی سازوں کو یہ احساس دلانا ہے کہ وہ اس ملک کو انسانوں کے رہنے کے قابل رہنے دیں۔ یہ ریاست ہی ہوتی ہے جو اپنے شہریوں کا مزاج تشکیل دیتی ہے اور رویے طے کرتی ہے، وہ چاہے تو انہیں امن پسند اور قانون کا احترام کرنے والا بنادے اور اگر وہ بدمعاش ریاست ہے تو انہیں بدمعاش بنادے، میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ پاکستان فلاحی نہیں بلکہ دوسری قسم کی ریاست ہے جہاں اول تو ہجوم خود ہی کسی کو سزا دینے کا فیصلہ کرتا ہے یا ہجوم کی منشا کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں، ریاست مذہب کے نام پر طاقت ور مسلح جتھوں کو تحفظ فراہم کرتی ہے اور پھر یہی جتھے ریاست کے لیے جب خطرہ بننے لگیں تو انہیں کچل دیا جاتا ہے۔

یہ ایک واضح پیغام ہے کہ ریاست کو مت للکارو، البتہ کمزور مذہبی اقلیتوں کے ساتھ جو سلوک چاہو کرو تمہیں کھلی چھوٹ ہے، اس صورتحال نے مجھے سخت مایوس کیا ہے۔ میں نے اس کتاب میں جو کچھ بھی شامل کیا وہ پوری نیک نیتی سے کیا، اگر میرے دیس میں مذہب کے نام پر مسلط سیاہ رات ڈھلی اور انسانیت کا سورج طلوع ہوا تو میں واپس لوٹ آں گی، پارلیمان میں اگر ایسے لوگ آئے اور ایسی حکومت تشکیل دے سکے جو قانون کا یکساں نفاذ ممکن بنا پائی تو میں آکر سرزمین وطن کے ماتھے پر بوسہ ضرور دوں گی، عدلیہ میں ایسے منصف ہوئے جو" مناسب یا ضمیر کے مطابق '' کی جگہ آئین کے مطابق فیصلے دینے والے ہوئے تو میرے لئے اپنی خاک کو وہاں واپس لانا اعزاز ہوگا جہاں سے میرا خمیر اٹھا ہے، بقول رفیع رضا۔ ہم نے مڑ مڑ کے اسی خاک

وطن کو دیکھا اور نہ جاتے ہوئے غدار کہاں دیکھتے ہیں ملک کو شدت پسندی کی دلدل میں دھکیلنے والے منافق جنرل ضیا کی طرف سے مذہبی طبقے کو ملنے والا توہین مذہب جیسے متعصّبانہ قانون کا ہتھیار واپس لینے تک پاکستان کو مہذب ریاست کہلانے کا کوئی حق نہیں، اگرچہ بربادی پھیلانے والے ہتھیاروں کا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا لیکن مجھے کوئی اعتراض نہیں کہ اگر اسے واحد اسلامی ایٹمی ریاست کہا جائے، اس پر بھنگڑا ڈالا جائے یا بغلیں بجائی جائیں۔

دنیا کی ساتویں بڑی اور اسلامی فوج ہونے کا ڈھنڈورا پیٹا جائے مگر میرے اور میرے وطن کے لئے مذہبی اقلیتوں کا مقتل ہونا ہرگز فخر کی بات نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ آج نہیں تو کل میرے وطن کے باشعور لوگ مذہبی اقلیتوں کے خلاف شدت پسند مسلم طاقت ور جتھوں کو الائسنس ٹوکل'' دینے کے پس پردہ ہماری بدمعاش ریاست کی حکمت عملی کو ضرور سمجھ جائیں گے اور پھر سناٹا بولے گا، جس روز پاکستان میں توہین مذہب کا یکطرفہ اور متعصّبانہ قانون منسوخ ہوگا اس دن انسانیت جی اٹھے گی الحمداللہ میں مسلمان ہوں، تمام مذاہب کا احترام کرتی ہوں اور ہرگز اس بات کی حامی نہیں کہ کسی بھی مذہب کی توہین یا اس کے ماننے والوں کی دل آزاری کی جائے، اس حوالے سے اقوام متحدہ کو اسلاموفوبیا کے خلاف بھی فوری قانون سازی کرنی چاہیے لیکن عقیدے کے اختلاف پر کسی انسان کی جان لینا ہرگز انصاف نہیں۔ مجھے اس کتاب کی اشاعت سے روکنے کے لئے جان سے مارنے کی دھمکیاں دی جارہی ہیں۔

آنسہ قراۃ العین تاج

کہانی جس کا ورق ورق خونچکاں ہے

موجودہ منظر نامہ ناسا کی جیمز ویب ٹیلی اسکوپ کی طرح ماضی کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہوگا کہ تازہ ترین صورتحال کا جائزہ لیا جائے، رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ، مسلم اکثریت روزے رکھ رہی ہے اور خشوع وخضوع سے نمازیں اور تراویح پڑھی جارہی ہیں، غیر مسلم دنیا نے اپنے مسلمان شہریوں کے لئے تمام ضروری اشیا کی قیمتیں کم کردی ہیں لیکن پاکستان میں ایسا کرنا بہت بڑا جرم ہے، پشاور میں سردار دیال سنگھ نے یہی گناہ کیا تھا، گراں فروش مافیا نے ان کی جان لے لی، کراچی میں ایک معروف ہندو ڈاکٹر کو فائرنگ کر کے جان سے مار دیا گیا، پھر بھی اقلیتوں کو تحفظ دینے کا شرمناک دعوی برقرار ہے۔ اپنی بات کا آغاز یہاں سے کر رہی ہوں کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے سر ظفر اللہ خان کو ملک کا پہلا وزیر خارجہ مقرر کیا جو مرزا غلام احمد کے پیروکار اور قادیانی تھے، 1940 میں انہوں نے قرارداد پاکستان کا مسودہ تیار کیا تھا تو پھر ابھی تک اس حوالے سے ریاست نے بابائے قوم کے خلاف بعد از مرگ کوئی مقدمہ کیوں نہیں چلایا؟ ممکن ہے مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کی کردار کشی اسی انتقامی سلسلے کی کڑی رہی ہو۔ ایک گناہ ان کا یہ بھی تھا کہ وہ مملکت کی ذمہ داریوں اور شہریوں کے عقیدے کو الگ الگ رکھنا چاہتے تھے، یہ ایک کھلا راز ہے کہ زیارت سے ایک کھٹارا ایمبولینس کے ذریعے ملک کے گورنر جنرل کو کراچی لانے کا مقصد ان کی جان لینا تھا، وہ کسمپرسی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے تو ملک ہائی جیک ہوگیا، پھر مشرقی پاکستان میں رہنے والی اکثریت نے مغربی پاکستان کی اقلیت سے آزادی حاصل کی، ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے لیکن مغربی پاکستان میں دھرتی سے غداری اور انگریز سے وفاداری کے صلے میں ملنے والی جاگیریں محفوظ ہوگئیں، لوٹ مار بند ہونے کا ڈر جاتا رہا اور پھر ضیا کا طویل تاریک دور مسلط ہوگیا۔ 1973 کے متفقہ دستور کے خالق ذوالفقار علی بھٹو بھارت کی قید سے جنگی قیدی آزاد کرانے اور ملک کو ایٹمی طاقت بننے کی راہ پر گامزن کرنے کے بعد مذہبی طبقے اور اس کے پس پشت پناہ گاہوں کے دبا میں آ کر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے چکے تھے، کمزور

جمہوریت پر ضیا کے شب خون نے جلتی پر تیل کا کام کیا، اس نے افغانستان میں سابق سوویت یونین کے خلاف کرائے پر امریکہ کی جنگ لڑنے کے لئے جہاد کا نعرہ بلند کیا لیکن مذہبی طبقے کی حمایت کے بغیر پاکستان کو اس پرائی آگ میں دھکیلنا ممکن نہیں تھا، خطے میں ہماری سرحدوں پر بیک وقت دو تبدیلیاں رونما ہوئیں، ایران میں شہنشاہت کا خاتمہ اور آیت اللہ خمینی کی قیادت میں شیعہ انقلاب جس نے خطہ عرب میں خطرے کی گھنٹی بجادی اور دوسری طرف افغانستان میں کمیونسٹوں کی دعوت پر روسی فوجوں کی آمد، گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا کے مصداق ضیا کی باچھیں کھل گئیں، امریکہ سے ڈالروں اور سعودی عرب سے ریال کی برسات ہونے لگی لیکن لاکھوں افغان مہاجرین کی آمد نے پاکستانی معاشرے کے تاروپور بکھیر دیے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جنرل ضیا اپنے حلف سے تاروپور روگردانی اور آئین سے غداری کا ارتکاب نہ کرتا تو ملک میں کاشنکوف کلچر آتا نہ ہیروئن کے نشے کی لعنت، سنی شیعہ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے اور نہ ہی معاشرہ منافقت سے آشنا ہوتا، نہ ہی آئین میں دوسو پچانوے سی کی آمرانہ شق شامل ہوتی اور نہ ہی مذہبی اقلیتوں سمیت مسلمانوں پر مصیبت نازل ہوتی، اس کی آڑ لے کر موقع پرستوں نے اپنے مخالفوں کو فکس کیا، مذہبی اقلیتوں پر توہین رسالت کے جھوٹے الزامات لگا کر ان کی جائیدادوں پر قبضے کیے، بستیوں کی بستیاں جلا دیں، ان الزامات کی زد میں زیادہ تر مسیحی برادری اور احمدی آئے جبکہ ہندو آبادی پر قہر کچھ اور طرح سے ٹوٹا اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے، ان کی بالغ اور نابالغ بچیوں کو اغوا کر کے زبردستی مسلمان بنانا اور نکاح کر لینا معمولی بن چکا ہے، یہودی خاندان پارسی بن کر رہ رہے ہیں اور محفوظ پارسی بھی نہیں۔ مذہبی اقلیتوں کے خلاف شدت پسند مسلم جتھوں کی کارروائیاں اور ریاست کی طرف سے ان جتھوں کی پشت پناہی کھلا راز ہے، تعصب اور منافقت کی انتہا ہے کہ توہین رسالت کے الزام میں مقدمہ درج ہو جائے تو الزام ثابت ہونے سے پہلے عام طور پر ہجوم قانون کو ہاتھ میں لے کر ملزم کی جان لے لیتا ہے، حال ہی میں ننکانہ صاحب میں پولیس اسٹیشن کے اندر ہی ایک بے گناہ کی جان لے لی گئی جبکہ الزام ثابت نہ ہونے کی صورت میں جھوٹے مدعی کے خلاف یہی قانون استعمال کرنے کی اجازت نہیں، مذہبی طبقہ ایسی کسی بھی ترمیم کا سخت مخالف ہے اور ذکر چھڑتے ہی مرنے مارنے پر تل جاتا ہے۔

پاکستان میں شیعہ برادری سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنے فرقے کے متعلق کس طرح کی باتیں سُننا پڑتی ہیں؟

’شیعہ کیا گھوڑے کی پوجا کرتے ہیں؟‘ ’کیا حلیم میں سنّی بچوں کا گوشت ملا ہوتا ہے؟‘ ’کیا تم لوگ سبیل کے پانی میں تُھوکتے ہو؟‘ ’یار، بُرا نہ ماننا لیکن ٹیچر کہہ رہی ہیں کہ تمھیں پہلا کلمہ پورا نہیں آتا۔ ذرا سُنا دو گی؟‘ پاکستان میں شیعہ برادری سے تعلق رکھنے والے بہت سے بچے اِس طرح کے سوالات اور باتیں سُنتے ہوئے بڑے ہوتے ہیں۔ اور کچھ کے لیے یہ سلسلہ بڑے ہونے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے والے مسلمان پاکستان کی آبادی کا تقریباً 20 فیصد حصّہ ہیں اور یہ لوگ اکثر خود کو حملوں اور توہینِ مذہب جیسے الزامات میں گھرا ہوا پاتے ہیں۔

رواں سال جنوری اور گذشتہ سال یعنی 2020 میں کئی ایسے واقعات پیش آئے ہیں جہاں کالعدم تنظیموں سے تعلق رکھنے والے افراد نے کھلِ عام شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے خلاف مظاہرے کیے۔ اس قسم کے زیادہ تر مظاہرے کراچی، کوئٹہ اور پنجاب کے کچھ علاقوں میں دیکھنے میں آئے۔

ایک اندازے کے مطابق 2001 سے لے کر آج تک پاکستان میں 2600 شیعہ افراد مختلف حملوں اور ٹارگٹ کلنگ میں ہلاک ہوئے ہیں۔ ان حملوں کی ایک بڑی وجہ اس کمیونٹی کے خلاف نفرت آمیز مواد اور دقیانوسی خیالات



ہیں جو معاشرے کے ایک طبقے میں رائج ہیں۔

دستیاب نفرت آمیز مواد اُن حملوں کا جواز بتائی جاتی ہیں جو اس کمیونٹی کی مساجد اور لوگوں پر کالعدم تنظیموں یا دہشت گرد تنظیموں کی طرف سے کیے جاتے ہیں۔

اسی لیے ہم نے چند خواتین سے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ اُن کے لیے پاکستان میں بطورِ شیعہ مسلم بڑا ہونا کیسا رہا؟ ان میں سے بیشتر کا تجربہ مختلف رہا ہے۔ کسی کو دوست اچھے ملے، کسی کو رشتہ دار یا پھر کسی سے گھر والوں نے قطع تعلق صرف اس بات پر کر لیا کیونکہ انھوں نے اپنے فرقے سے باہر شادی کی۔ لیکن ایک لفظ جو ان سب نے مشترکہ طور پر بچپن میں یا بڑے ہونے کے بعد سُنا ہے، وہ ہے 'کافر'۔

میری ایک دوست نے بتایا کہ جب وہ دوسری جماعت میں تھیں تب ہی اُن سے ان کے عقیدے کے متعلق سوال ہونا شروع ہو گئے تھے۔

'مجھ سے بچپن میں میری دوست نے پوچھا کہ کیا تم لوگ گھوڑے کی پوجا کرتے ہو؟ اس وقت میرے پاس جواب نہیں تھا۔ لیکن پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ میں شاید باقی لوگوں سے مختلف ہوں۔ ہچکچاہٹ تو نہیں لیکن تھوڑا سا عجیب لگتا تھا، اتنی ذاتی بات کسی کو بتاتے ہوئے کہ میری شناخت کیا ہے۔'



ان کے لیے کراچی میں بڑا ہونا مشکل نہیں تھا۔ بینش کے لیے مشکل مرحلہ بڑے ہونے کے بعد شروع ہوا۔

'بچپن میں تو یہ تفریق پتا ہی نہیں تھی۔ 1990 کی دہائی میں ہمارے برابر والے گھر میں سُنّی لوگ رہتے تھے۔ وہ بھی اس لیے پتا چلا کیونکہ وہ نذر یا نیاز نہیں کھاتے تھے۔ لیکن جب میری امّی شدید بیمار ہوئیں، تو سب سے پہلے اُنھیں کے گھر سے کھانا آیا اور مدد کی گئی۔'

'اب بڑے ہونے کے بعد یہ ہوا کہ میں نے اپنی پسند سے شادی کی، اور مسلک پوچھے بغیر کی۔ مجھے اپنے گھر والوں کو منانا بھی نہیں پڑا۔ لیکن اب میرے گھر والے مجھ سے بات نہیں کرتے کیونکہ میں نے سنّی لڑکے سے شادی کی ہے۔ اور اب یہ حال ہے کہ میری چھوٹی بیٹی اپنے نانا اور نانی کو نہیں جانتی۔ جبکہ میرے شوہر کے گھر والوں نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔'

بینش نے کہا کہ انھیں 2015 میں گھر ڈھونڈنے کے دوران کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ 'میں جہاں بھی فون پر بتاتی تھی کہ میری شناخت کیا ہے۔ تو مجھے کہا جاتا تھا کہ نہیں آپ کو گھر نہیں دے سکتے کیونکہ آپ لوگ مجلس کریں گے۔'

کوئٹہ سے تعلق رکھنے والی والی لڑکی نے بتایا کہ 'میرا بچپن یہ پوچھتے ہوئے گزرا ہے کہ آج کتنے لوگوں کو مارا گیا ہے؟ اور جس دن نہیں مارا جاتا تھا تو وہ دن سکون سے گزر جاتا تھا۔'



2011 کے حملوں کے بعد ان کے دوست ان سے ملنا کم کر چکے تھے۔ 'میں جہاں بھی جاتی تھی مجھے خود پر نظریں جمی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مجھے کہا گیا کہ آپ کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے کیونکہ آپ کی وجہ سے ہم بھی نشانہ بنیں گے۔' لاہور سے تعلق رکھنے والی میری ایک دوست نے بتایا کہ انھوں نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ پہلے زمانے میں حالات بہت اچھے تھے۔ 'ہمیں بتایا جاتا ہے کہ لوگ موچی دروازے اور لاہور کے دیگر مقامات پر مل جل کر عاشورہ اور محرم کے لیے تیاریاں کیا کرتے تھے۔'

ان اچھے حالات کا حوالہ کئی جگہوں پر کئی لوگوں نے دیا ہے۔

اگر مان لیا جائے کہ حالات اچھے تھے، تو خرابی کب پیدا ہوئی؟

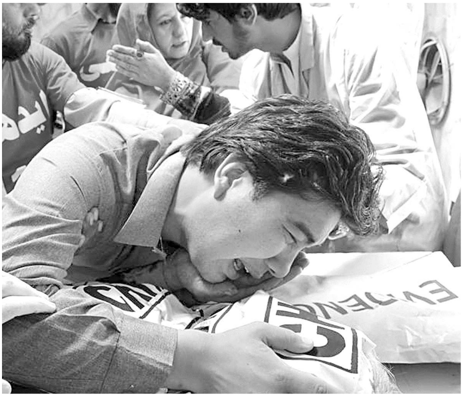
ماضی میں بیشک پاکستان میں سماجی ہم آہنگی رہی ہے لیکن کچھ بڑے واقعات بھی رونما ہوئے ہیں جن کے نتیجے میں اُس وقت مسلک پرستی اور نفرت آمیز گفتگو کو فروغ ملا۔' 1963 میں خیر پور کے ٹھیڑی گاؤں میں ہونے والے فسادات سب کے سامنے ہیں۔ انگریزوں کے برِصغیر سے جانے اور تقسیم کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان حالات اتنے اچھے نہیں رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ٹینشن رہی ہے خاص طور سے عاشورہ اور دیگر مواقعوں پر صورتحال کشیدہ ہوتی رہی ہے چاہے پاکستان میں ہو یا خطے کے دیگر علاقوں میں جس کا اثر یہاں بھی محسوس کیا گیا



ہے۔' صحافی نے ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے ایک پروگرام میں ایک لیکچر کے دوران پاکستان میں فرقہ واریت اور اس سے جڑے حالات کو کچھ یوں بیان کیا تھا۔ 'پاکستانی اپنے ملک میں جاری فرقہ وارانہ واقعات کی حقیقت کو ماننے سے انکاری ہیں۔ لیکن پاکستان کی قومی شناخت کے کچھ اسباب متنازع ہیں۔' انھوں نے کہا کہ 'پاکستان بنیادی طور پر فرقہ پرست ملک نہیں ہے۔ پاکستان میں شیعہ اور سنّی ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرتے۔ اور اب تک جتنے بھی فسادات ہوئے ہیں وہ کچھ شہروں کے مخصوص حصوں تک محدود رہے ہیں جیسا کہ کراچی، کوئٹہ، اور پنجاب اور خیبر پختونخوا کے کچھ علاقے۔' فرقہ پرستی پر یقین نہ رکھنے والا ملک فرقہ واریت اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فسادات کا حصّہ کیسے بنا؟ جب پاکستان مشرقِ وسطیٰ میں ہونے والی فرقہ وارانہ جنگ کے لیے ایک الگ 'میدانِ جنگ' کے مقام کے طور پر استعمال ہونا شروع ہوا۔ ایک میرے ایک دوست لیکچر کے دوران کہا کہ 1947 کے بعد پاکستانی رہنما جن شخصیات کو مثالی گردانتے رہے وہ نا صرف ہندو مخالف تھے بلکہ شیعہ مخالف بھی تھے۔' ایسے لوگوں کی قومی سطح پر پذیرائی کی گئی جو فرقہ وارانہ سوچ کے حامی تھے۔ 1979 کے ایرانی انقلاب سے پہلے پاکستان میں رہنے والے شیعہ ایران کے انقلابی اور شدت پسند نظریے پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کرتے تھے۔' بلکہ زیادہ تر شیعہ عالم عراق کے شہر نجف میں تعلیم حاصل



کرنے کو ترجیح دیتے تھے اور اس کے نتیجے میں ان کے خیالات اور رائے ایران کے آیت اللہ خمینی کے نظریات سے خاصے مختلف تھے۔‘ ایک دوست نے بتایا کہ ’معاملات تب بگڑے جب ایران کا انقلاب پاکستان میں چند افراد کے لیے مشعلِ راہ بنا۔ اور خطے میں سعودی عرب اور ایران کی فرقہ وارانہ سیاست اور فسادات کے نتیجے میں پاکستان کو بارہا بطورِ ’میدانِ جنگ‘ استعمال کیا جاتا رہا۔ اور یہ فرقہ وارانہ فسادات ایک ’مسلط کی گئی جنگ‘ کا نتیجہ ہیں۔‘ اس سوچ اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فساد کے بارے میں میری ایک





سہیلی نے کہا کہ ’کبھی دوستوں کے ساتھ مذاق میں، میں بھی کہہ دیتی ہوں کہ ’کافر، کافر، شیعہ کافر‘ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ سُننا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے پتا ہے کہ اس کا ہماری ذات اور ہمارے وجود پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔‘ سہیلی نے کہا کہ ’ہم صدیوں پرانی جنگ اور خیالات کو ایک دن یا ایک بلاگ لکھ کر ختم نہیں کر سکتے لیکن بات چیت کر سکتے ہیں۔ ہم سے سوال پوچھیں لیکن ہمارے جواب سمجھنے کی کوشش بھی کریں۔‘ ’میرے زیادہ تر دوست سنّی ہیں اور ہم اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ کس کا مذہب اور فرقہ کیا ہے۔ ریاست آپ کو کہہ دے گی کہ انھوں نے کئی ہزار نفرت سے لیس کتابوں کو جلا دیا ہے۔‘ لیکن آپ ذہنیت اور نظریے کو نہیں جلا یا تباہ کر سکتے۔ اس پر بات چیت کرنے سے ہی کچھ ہو سکے گا۔‘ جبکہ مرضیہ نے کہا کہ ’اتنا کچھ ہونے کے باوجود ہم اب بھی کہتے ہیں کہ آئیں اور بات کریں۔ طالب بن کر سوچیں نہ کہ طالبان بن کر۔‘

پاکستان میں شیعہ سنی فسادات کا خطرہ

پاکستان میں انسانی حقوق کے کارکنوں نے ملک میں شیعہ مسلمانوں کے خلاف حالیہ کچھ عرصے میں مسلسل سخت گیر موقف کے حامل سنی گروہوں کی جانب سے بیان بازی پر شدید تشویش ظاہر کی ہے۔

پاکستان میں انسانی حقوق کے کارکنان کی جانب سے کہا گیا ہے کہ حالیہ کچھ عرصے میں ملک بھر میں توہین مذہب سے متعلق کیسز میں اضافہ دیکھا گیا ہے اور ان میں زیادہ تر میں شیعہ مسلمانوں پر الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ پاکستان میں شیعہ مسلمانوں کو انتہا پسند سنی گروہوں کی جانب سے ان دنوں شدید دباؤ کا سامنا ہے۔

توہین مذہب کے الزامات

انسانی حقوق کی تنظیموں کے مطابق صرف اگست کے مہینے میں پاکستان میں توہین مذہب کے کم از کم 40 مقدمات درج کروائے گئے۔ ملک کے خودمختار انسانی حقوق کمیشن کے مطابق زیادہ تر مقدمات شیعہ مسلمانوں کے خلاف درج کروائے گئے، جن میں الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے اپنے مذہبی اجتماعات میں توہین مذہب کا ارتکاب کیا ہے۔

جمعے کے روز ملک کے جنوبی شہر اور تجارتی مرکز کراچی میں سنی تنظیموں کی جانب سے ایک بہت بڑی ریلی نکالی گئی۔ اس ریلی



میں ہزاروں افراد شریک ہوئے اور شیعہ مخالف نعرے لگائے گئے، جن میں شیعہ کافر تک کے نعرے شامل تھے۔

ایران اور سعودی عرب

گو کہ اسلام کے اعتبار سے شیعہ اور سنی تنازعہ صدیوں پرانا ہے، تاہم ایران میں انقلاب اور پھر ایران اور سعودی عرب کے درمیان کشیدگی کے تناظر میں پاکستان میں انیس سو اسی کی دہائی میں شیعہ سنی کشیدگی اپنے عروج پر دیکھی گئی تھی۔ سنی گروہوں کا الزام ہے کہ شیعہ اپنے اجتماعات میں پیغمبر اسلام کے چند قریبی ساتھیوں کی توہین کرتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ گزشتہ ایک دہائی میں پاکستان میں عسکریت پسند سنی گروہوں کی جانب سے شیعہ مسلمانوں پر حملوں میں شدت دیکھی گئی ہے۔ تشدد کا خوف شیعہ مسلمانوں کے خلاف توہین مذہب کے بڑھتے الزامات کے تناظر میں خدشات ظاہر کیے جارہے ہیں کہ پاکستان فرقہ وارانہ تشدد کی جانب بڑھ سکتا ہے۔ کشیدگی میں یہ غیر معمولی اضافہ ہے۔ ہمیں خدشات ہیں کہ ملک میں فرقہ وارانہ تشدد میں اضافہ ہوسکتا ہے۔“



انسانی حقوق کی تنظیموں نے حکومت پر بھی تنقید کی ہے کہ وہ فرقہ وارانہ نظریات کی حامل تنظیموں کی سرگرمیاں روکنے کے لیے کافی اقدامات نہیں کر رہی ہے۔ ان تنظیموں میں بعض پاکستانی حکومت کی جانب سے کالعدم قرار دی گئی تنظیمیں بھی

ہیں۔ حکام شدت پسند گروہوں کی سرگرمیوں کے انسداد کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھا رہے ہیں۔ بٹ نے کہا، حالات خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ فقط شیعوں کے لیے نہیں بلکہ تمام اقلیتی برادریوں کے لیے۔ حکومت نے فرقہ وارانہ نظریات کی حامل تنظیموں سے چشم پوشی اختیار کر رکھی ہے۔ یہ تنظیمیں شیعہ مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذہبی اقلیتیوں سے متعلق بھی نفرت انگیزی میں مصروف ہیں۔

اہل تشیع / ہزارہ / اسماعیلی برادری پر حملے

اہل تشیع برادری کے تمام گروہوں کو شدید خطرات کا سامنا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان پر حملوں میں ملوث افراد عدالتوں سے با آسانی رہا ہو جاتے ہیں۔ انہیں خصوصی عدالتوں سے ہی سزا مل پاتی ہے۔ 28 دسمبر کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل قمر باجوہ نے دہشت گردی کے متعدد الزامات میں مجرم قرار پانے والے آٹھ افراد کی سزائے موت کی توثیق کی۔ ان میں چار افراد مئی 2015ء میں کراچی میں اسماعیلی برادری کی بس پر حملے میں ملوث تھے جس میں 45 مسافر ہلاک اور چھ زخمی ہو گئے تھے۔



2014 میں پاکستان میں انسانی حقوق کی ایک بڑی تنظیم ہیومین رائٹس کمیشن آف پاکستان کی جاری ہونے والی سالانہ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ 2013 کے اوائل میں بلوچستان میں فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات میں

200 سے زائد ہزارہ شیعہ ہلاک ہوئے۔جبکہ ایچ آرسی پی کی رپورٹ کے مطابق 2013 میں دوسو سے زائد فرقہ وارانہ حملوں میں 1687 افراد مارے گئے۔ایک اور رپورٹ میں بتایا گیا کہ 2013 میں پاکستان میں ہونے والے ابدافی حملوں میں 400 سے زائد شیعہ مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔بلوچستان میں ہزارہ برادری سے تعلق رکھنے والے کم ازکم 200 شیعوں کو صوبائی دارالحکومت کوئٹہ یا اس کے اطراف میں قتل کیا گیا۔

جنوری میں ایک خودکش حملے میں ہزارہ برادری کے 96 افراد جاں بحق اور کم ازکم 150 زخمی ہوئے۔فروری میں کوئٹہ کے ہزارہ ٹاؤن کی سبزی منڈی میں بم پھٹنے سے کم از کم 184 افراد جاں بحق اور 160 سے زائد زخمی ہوئے۔ دونوں حملوں کی ذمہ داری لشکر جھنگوی نے قبول کی۔



مارچ میں بندرگاہ والے شہر کراچی میں جب شیعہ اکثریتی محلہ ایک بم حملے کا نشانہ بنا تو کم ازکم 47 شیعہ ہلاک اور 135 زخمی ہوئے تھے۔کوئی 150 اپارٹمنٹ اور 10 دکانیں تباہ ہوئی تھیں۔سارا سال پاکستان بھر میں درجنوں شیعوں کو نشانہ بنا کر قتل کیا گیا۔

گزشتہ چند برسوں کا جائزہ لیں تو صورت حال مزید واضح ہو جاتی ہے۔نومبر میں کراچی میں متعدد گروہوں نے

ایک شیعہ عالم علامہ یوسف حسین اور سابق سینیٹر فیصل رضا عابدی کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کیا۔ یوسف حسین کونفرت پر مبنی تقریر کے الزام میں لاؤڈ سپیکر کے غلط استعمال کے قانون کے تحت حراست میں لیا گیا۔ ان پر مئی میں قتل ہونے والے اہل تشیع خرم ذکی کی نماز جنازہ میں تشدد کو ہوا دینے کا الزام تھا۔ چند روز بعد انہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

میڈیا رپورٹس کے مطابق عابدی کو تبلیغی جماعت (سنی گروہ) سے تعلق رکھنے والے دو افراد کے قتل کے معاملے اور غیر قانونی ہتھیار رکھنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تاہم بعد میں سندھ کے وزیر اعلیٰ نے رپورٹرز کو بتایا کہ عابدی کو محض غیر قانونی ہتھیار رکھنے کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا۔۔شیعہ نمائندوں نے بتایا کہ حکومت نفاذ قانون کے اقدامات کی آڑ میں انہیں نشانہ بنا رہی ہے۔وزیر اعلیٰ نے ایسے الزامات کی تردید کی۔

26 ستمبر کو وفاقی دار الحکومت اسلام آباد کی انتظامیہ (آئی سی ٹی اے) نے فرقہ وارانہ تشدد کے خطرے کے پیش نظر 11 مذہبی راہنماوں کو خطبات دینے اور لوگوں سے خطاب سے روک دیا۔انتظامیہ نے فرقہ وارانہ تشدد ابھارنے کے مرتکب قرار دیے گئے 16 مزہبی راہنماؤں کو بھی اسلامی مہینے محرم سمیت دو ماہ کے لیے اسلام آباد داخلے سے روک دیا۔صوبائی حکومتوں نے بھی عاشورہ کے موقع پر شیعہ مذہبی تقریبات کی حفاظت کے لیے ہزاروں کی تعداد میں پولیس اور سکیورٹی اہلکاروں کی تعیناتی کا اعلان کیا۔

اکتوبر میں راولپنڈی میں انسداد دہشت گردی کی عدالت نے 2013ء میں عاشورہ کے بعد شیعہ مسجد پر حملہ کرنے والے 12 افرد کو بری کر دیا۔عدالت کا کہنا تھا کہ پولیس ان کے خلاف خاطر خواہ ثبوت پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔

دوسو پچانوے سی اقلیتوں کے خلاف ڈیتھ وارنٹ:

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان ہو یا مینارٹیز الائنس ان سمیت دیگر ذرائع سے اب تک جتنی مطالعاتی رپورٹس سامنے آئی ہیں ان میں یہ بات واضح ہے کہ دوسو پچانوے سی کی شق انتہائی یکطرفہ،غیر منصفانہ اور متعصّبانہ ہے،افسوس اس بات کا ہے کہ اٹھارہویں ترمیم کے وقت آئین کے قریبا ایک سو آرٹیکلز کا جائزہ لے

کر ترمیم وتخفیف کی گئی لیکن آمر ضیا کی داخل کردہ غیر آئینی شق دوسو پچانوے سی کو خارج نہ کیا جا سکا۔سوال یہ ہے کہ معاشی اور سیاسی عدم استحکام کا شکار اسلامی جمہوریہ پاکستان جہاں توہین رسالت جیسے قانون کی بنیاد پر جیل میں سماعت کے دوران ملزم جنید حفیظ کے وکیل کو جج کے سامنے قتل کی دھمکیاں دی گئیں اور پھر سچ مچ اس وکیل کو چیمبر میں فائرنگ کر کے جان سے مار دیا گیا وہاں اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ مستقبل میں اس حوالے سے ریاست اپنی ذمہ داریاں نبھا سکے گی؟ ہماری وزارت خارجہ کے لئے انسانی حقوق سے متعلق امریکہ، یورپی یونین اور اقوام متحدہ کی سالانہ رپورٹس میں پاکستان پر لگائے گئے الزامات کو جھٹلانا ہرگز مشکل نہیں لیکن سچ یہ ہے کہ وہ الزامات حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ پاکستان میں کوئی مذہبی اقلیت مسلم اکثریت کے شر سے محفوظ نہیں اور تو اور شیعہ برادری جو ملکی آبادی کا لگ لگ پندرہ سے بیس فیصد ہے مذہبی اقلیت نہ ہونے کے باوجود فرقہ وارانہ ہدفی ہلاکتوں کی زد میں ہے، کراچی سمیت ملک بھر میں عموما اور بلوچستان کوئٹہ میں خصوصا ہزارہ برادری کو نسل کشی کا سامنا ہے اور کوئی بھی برسر اقتدار حکومت بیانات سے کبھی آگے نہیں بڑھی، انٹرنیٹ پر جاری کی گئی مختلف مطالعاتی رپورٹس کے مندرجات کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے تا کہ پڑھنے والوں کو حقائق کا علم ہو سکے، میری کوشش صرف اس حد تک ہے کہ پاکستان کو ایک پر امن، ترقی یافتہ اور خوشحال ملک بنانے کے لئے برداشت، رواداری اور بین المذہب ہم آہنگی جیسی اقدار کو زندہ کیا جا سکے، اس کے لئے ضروری ہے کہ دوسو پچانوے سی سمیت تمام ایسے قوانین کا خاتمہ کیا جائے جنہیں مذہبی اقلیتوں سمیت مسلکی مخالفین کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے، اس میں مزید تاخیر انتہائی نقصان دہ ہوگی۔ انسانی حقوق کمیشن آف پاکستان کئی سالوں سے توہین مذہب کے کیسز پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کیسز میں زیادہ تر مسلمانوں کو ہی پکڑا جاتا ہے۔ نیشنل کمیشن فار جسٹس اینڈ پیس کے مطابق 1987 سے لے کر اب تک 633 مسلمانوں، 494 احمدیوں، 187 عیسائیوں، اور 21 ہندوں کے خلاف ان قوانین کے تحت 13 مقدمات درج کیے جا چکے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر توہین قرآن کے مقدمات ہیں اور توہین رسالت کے مقدمات قدرے کم ہیں۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ ان کیسز میں اقلیتی برادری کا تناسب بہت زیادہ ہے اور اکثر ان کا استعمال ذاتی دشمنیوں اور لڑائیوں کی بنیاد پر ہوتا ہے اور ان کا مذہب سے کم ہی تعلق ہوتا ہے۔ نامہ نگاروں کا کہنا ہے کہ توہین مذہب کا صرف الزام لگنا، یا ملزم کا دفاع کرنا ہی کسی کے ہدف



بن جانے کے لیے کافی ہے۔ پاکستانیوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ توہین مذہب کے مرتکب لوگوں کو سزا ملنی چاہیے۔ تاہم دینی تعلیمات کیا ہیں اور آج کے قوانین ان کو کس طرح لاگو کرتے ہیں، اس حوالے سے زیادہ سمجھ بوجھ نہیں پائی جاتی۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قوانین جس شکل میں جنرل ضیا کے دور میں بنائے گئے وہ براہ راست قرآن میں سے لیے گئے ہیں اور چنانچہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ جب اس قانون کے معروف ناقد سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو انھی کے محافظ نے قتل کر دیا تو پاکستان میں لوگوں کی رائے منقسم تھی کہ ان کے قاتل کو ہیرو مانا جائے یا قاتل۔ گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو ان کے ہی محافظ نے قتل کر دیا تو پاکستان میں لوگوں کی رائے منقسم تھی کہ ان کے قاتل کو ہیرو مانا جائے یا نہیں۔ سلمان تاثیر کے قتل کے ایک ماہ بعد مذہبی اقلیتوں کے وزیر شہباز بھٹی جنھوں نے اس قانون کی مخالفت کی تھی، کو بھی اسلام آباد میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ جب 2016 میں سلمان تاثیر





کے قاتل ممتاز قادری کو سزائے موت دی گئی تو ان کے جنازے میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ متعدد سیکیولر جماعتوں کے ایجنڈے پر توہین مذہب کے قوانین میں اصلاحات کرنا رہا ہے۔ تاہم اس میں زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی جس کی بنیادی وجہ معاملے کی حساسیت ہے۔ 2010 میں برسر اقتدار پاکستان پیپلز پارٹی کی رہنما شیری رحمان نے اس حوالے سے ایک بل متعارف کروایا۔ اس بل میں مذہبی جرائم کے حوالے سے پروسیجر میں تبدیلی کے لیے کہا گیا تھا تا کہ یہ کیسز اعلی پولیس افسران کے پاس جائیں اور اعلی عدالتیں ہی ان کمیسز کو سنیں۔ مگر فروری 2011 میں مذہبی جماعتوں کے زبردست دباؤ کے بعد اس بل کو واپس لے لیا



گیا۔ عمران خان نے اپنی انتخابی مہم کے دوران ان قوانین کی حفاظت کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ گذشتہ 12 سال میں پاکستان میں توہین مذہب کے الزامات لگائے جانے کا سلسلہ تیزی سے بڑھا ہے۔ سینٹر فار ریسرچ اینڈ سکیورٹی سٹڈیز (سی آر ایس ایس) کے ڈیٹا کے مطابق سال 2014 اور 2020 میں

سب سے زیادہ توہین مذہب کے الزامات لگائے گئے جن میں سے زیادہ کیسز صوبہ مقدمات درج کیے جا چکے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر توہین قرآن کے مقدمات ہیں اور توہین رسالت کے مقدمات قدرے کم ہیں۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ ان کیسز میں اقلیتی برادری کا تناسب بہت زیادہ ہے اور اکثر ان کا استعمال ذاتی دشمنیوں اور لڑائیوں کی بنیاد پر ہوتا ہے اور ان کا مذہب سے کم ہی تعلق ہوتا ہے۔ نامہ نگاروں کا کہنا ہے کہ توہین مذہب کا صرف الزام لگنا، یا ملزم کا دفاع کرنا ہی کسی کے ہدف بن جانے کے لیے کافی ہے۔ پاکستانیوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ توہین مذہب کے مرتکب لوگوں کو سزا ملنی چاہیے۔ تاہم دینی تعلیمات کیا ہیں اور آج کے قوانین ان کو کس طرح لاگو کرتے ہیں، اس حوالے سے زیادہ سمجھ بوجھ نہیں پائی جاتی۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قوانین جس شکل میں جنرل ضیا کے دور میں بنائے گئے وہ براہ راست قرآن میں سے لیے گئے ہیں اور چنانچہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ جب اس قانون کے معروف ناقد سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو انھی کے محافظ نے قتل کر دیا تو پاکستان میں لوگوں کی رائے منقسم تھی کہ ان کے قاتل کو ہیرو مانا جائے یا قاتل۔ گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو ان کے ہی محافظ نے قتل کر دیا تو پاکستان میں لوگوں کی رائے منقسم تھی کہ ان کے قاتل کو ہیرو مانا جائے یا نہیں۔ سلمان تاثیر کے قتل کے ایک ماہ بعد مذہبی





اقلیتوں کے وزیر شہباز بھٹی جنھوں نے اس قانون کی مخالفت کی تھی، کو بھی اسلام آباد میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ جب 2016 میں سلمان تاثیر کے قاتل ممتاز قادری کو سزائے موت دی گئی تو ان کے جنازے میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ متعدد سیکولر جماعتوں کے ایجنڈے پر توہین مذہب کے قوانین میں اصلاحات کرنا رہا ہے۔ تاہم اس میں زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی جس کی بنیادی وجہ معاملے کی حساسیت ہے۔ 2010 میں برسر اقتدار پاکستان پیپلز پارٹی کی رہنما شیری رحمان نے اس حوالے سے ایک بل متعارف کروایا۔ اس بل میں مذہبی جرائم کے حوالے سے پروسیجر میں تبدیلی کے لیے کہا گیا تھا تاکہ یہ کیسز اعلی پولیس افسران کے پاس جائیں اور اعلیٰ عدالتیں ہی ان کیسز کو سنیں۔ مگر فروری 2011 میں مذہبی جماعتوں کے زبردست دبا کے بعد اس بل کو واپس لے لیا گیا۔ عمران خان نے اپنی انتخابی مہم کے دوران ان قوانین کی حفاظت کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ گذشتہ 12 سال میں پاکستان میں توہین مذہب کے الزامات لگائے جانے کا سلسلہ تیزی سے بڑھا ہے۔ سینٹر فار ریسرچ اینڈ سکیورٹی سٹڈیز (سی آر ایس ایس) کے ڈیٹا کے مطابق سال 2014 اور 2020 میں سب سے زیادہ توہین مذہب کے الزامات لگائے گئے جن میں سے زیادہ کیسز صوبہ پنجاب کے مختلف شہروں سے رپورٹ ہوئے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سے لے کر اب تک توہین مذہب کے الزام کی وجہ سے ماورائے عدالت قتل میں 90 لوگ مارے جا چکے ہیں۔



ماضی میں ایسی مثالیں بھی سامنے آئیں جن میں توہین مذہب کا الزام کسی ذاتی چپقلش کی وجہ سے لگایا گیا۔ رواں ماہ کے اوائل میں کراچی ایئر پورٹ پر دو ملازمین کے درمیان گاڑی کی پارکنگ پر تنازع ہوا جس کے بعد ایک ملازم نے دوسرے پر توہین مذہب کا جھوٹا الزام لگا دیا اور بعد میں اس پر معافی بھی مانگی۔ سول ایوی ایشن اتھارٹی نے جھوٹا الزام لگانے والے ملازم کو معطل کر کے واقعے کی تحقیقات کا اعلان کیا تھا۔ نومبر 2020 میں پنجاب کے شہر خوشاب میں توہین مذہب کا الزام لگا کر اپنے ہی بینک کے مینیجر کو قتل کرنے والے سکیورٹی گارڈ کا کیس ہو یا پھر سیالکوٹ میں سری لنکن مینیجر کا قتل، توہین مذہب کے کیسز میں اکثر وجوہات وہ نہیں ہوتیں جو بظاہر ابتدا میں الزام لگانے والوں کی جانب سے بتائی جاتی ہیں۔ پریانتھا کمار کو ایک مشتعل ہجوم نے توہین مذہب کے الزام میں تشدد کر کے ہلاک کرنے کے بعد ان کی لاش کو آگ لگا دی تھی۔ اس دن پیش آنے والے واقعات کو بیان کرتے ہوئے عادل نے بتایا کہ کچھ عرصے پہلے میرے پاس ایک بندہ آیا اور مجھے کہنے لگا کہ میں مندروں کی مرمت کا ٹینڈر جمع کروانا چاہتا ہوں۔ میں نے بطور افسر اس کا ٹینڈر لینے سے انکار کر دیا کیونکہ تمام کنٹریکٹرز کے لیے ٹینڈر بھرنے کا ایک وقت مقرر تھا جبکہ وہ شخص وقت مقررہ کے بعد آیا تھا۔ اس نے اصرار کیا کہ آپ میرا ٹینڈر جمع کریں۔ وہ بزرگ کنٹریکٹر تھا اور اس کی عمر غالباً 85 سے 90 سال تھی۔ میں نے اسے کہا کہ میں یہ نہیں کر سکتا، آپ وقت دیکھیں، آپ کافی دیر سے آئے ہیں اور ہم نے اشتہار پر یہ لکھا تھا کہ کس وقت تک آپ ٹینڈر جمع کروا سکتے ہیں۔ یہ باقی لوگوں کے ساتھ نا

انصافی ہوگی اگر میں آپ کا ٹینڈر لے لوں گا۔اس وقت میرے دفتر میں دو تین اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ان کی موجودگی میں اس کنٹریکٹر نے بدتمیزی شروع کر دی اور مجھے برا بھلا کہنے لگا۔عادل مزید بتاتے ہیں کہ اس کے بعد اس نے مجھے کہا کہ آپ ہندو ہیں، اس لیے آپ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کر رہے ہیں۔ میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی اور یہ بھی کہا کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے دشمن ہیں تو یہ کام تو ہے ہی مندروں کا، پھر آپ کیوں یہ کرنا چاہتے ہیں۔آپ کو تو اس ٹینڈر پر اپلائی ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس کے بعد وہ شخص میرے علاوہ وہاں بیٹھے لوگوں سے بھی الجھنے لگا کیونکہ انھوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔شور مچاتا ہوا وہ شخص کمرے سے باہر چلا گیا۔ایک گھنٹے بعد میرے ہی دفتر کا ایک ملازم میرے پاس آیا کہ اور کہنے لگا کہ وہ کنٹریکٹر تو باہر سب کو کہہ رہا ہے کہ آپ نے توہین مذہب کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ جب اس نے مجھے یہ بتایا تو مجھے پاں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔اس وقت مجھے کچھ سمجھ کہ یہ میرے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ میں تو وہ شخص ہوں جس میں مذہبی رواداری بہت زیادہ ہے۔اس وقت خوف اتنا زیادہ تھا کہ میں سن ہو گیا اور مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہوا کیا ہے۔بہت سے خدشات نے مجھے گھیر لیا تھا۔جیسا کہ میں ویسے بھی ہندو ہوں تو کیا یہ لوگ بھی مجھے ایسے ہی قتل کر دیں گے جیسے سری لنکن مینیجر کو قتل کیا گیا۔سیالکوٹ میں دسمبر 2021 کے دوران ایک سری لنکن مینیجر پر توہین مذہب کا الزام اس وقت لگایا گیا تھا جب فیکٹری کے



ملازمین اوران کے درمیان مذہبی سٹیکر اتارنے کے مسئلے پر جھگڑا ہوا تھا۔تھنک ٹینک کا کہنا ہے کہ آزادی سے اب تک توہین مذہب کے ایک ہزار 415 الزامات اور مقدمات میں 89 شہریوں کو قتل کیا گیا۔ رپورٹ کے مطابق سینٹر فار ریسرچ اینڈ سیکیورٹی اسٹڈیز (سی آر ایس ایس) نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ 1947 سے 2021 تک توہین مذہب کے الزامات میں 18 خواتین اور 71 مردوں کو ماورائے عدالت قتل کیا گیا، اب تک 107 خواتین اور ایک ہزار 308 مردوں پر توہین مذہب کے الزامات لگائے گئے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ سال 2011 سے 2021 کے دوران ایک ہزار 287 شہریوں پر توہین



مذہب کے الزامات لگائے گئے۔ محققین کا ماننا ہے کہ حقیقی تعداد اس سے بھی زیادہ ہوگی کیونکہ توہین مذہب کے تمام کیسز میڈیا پر رپورٹ نہیں کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ 70 فیصد سے زائد کیسز پنجاب میں رپورٹ ہوئے۔ اعدادوشمار سے ظاہر ہوتا ہیکہ 55 کیسز دارالحکومت اسلام آباد میں دائر کیے گئے، جو خیبر پختونخوا اور کشمیر میں رپورٹ ہونے والے مجموعی کیسز سے زیادہ ہیں۔ علاوہ ازیں پنجاب میں سب سے زیادہ ایک ہزار 98 کیسز رپورٹ ہوئے جبکہ سندھ دوسرے نمبر پر ہے جہاں توہین مذہب کے 177 کیسز رپورٹ ہو چکے ہی، اس زمرے میں خیبر پختونخوا میں 33، بلوچستان میں 12 جبکہ آزاد جموں و کشمیر میں 11 کیسز سامنے آچکے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ توہین مذہب کے قانون کا غلط استعمال عدالت

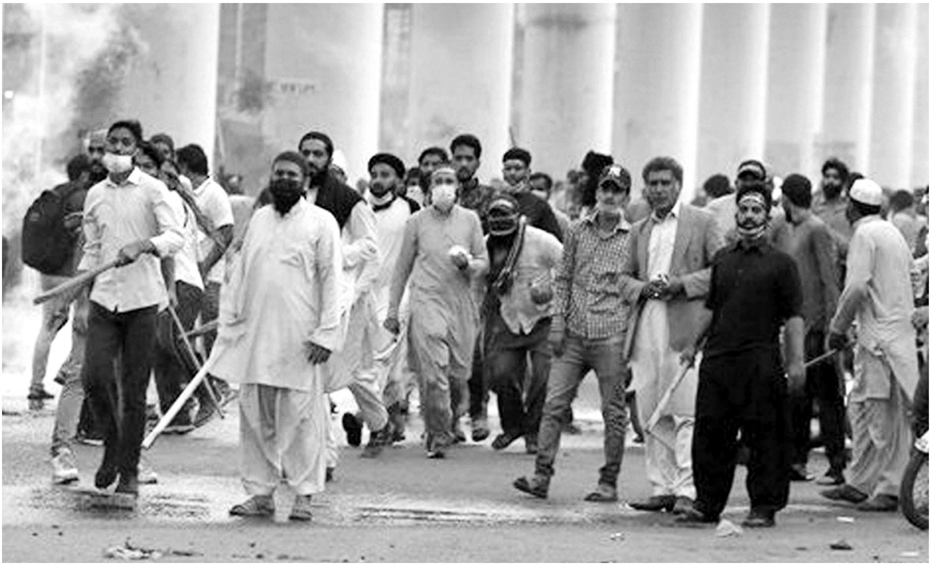
نے غیر قانونی قرار دیا ہے، اس سے قبل اسلام آباد ہائی کورٹ نے قانون سازوں کو تجویز دی تھی کہ موجودہ قانون میں ترمیم کریں تا کہ ایسے افراد جو توہین مذہب کے غلط الزامات لگاتے ہیں انہیں یکساں سزا دی جائے۔ پاکستان کے توہین مذہب کے قانون اور اس کی سماجی وسیاسی اثرات پر بحث کی دلیل وہ افراد جو اسلام کا احترام نہیں کرتے انہیں سزا دی جائے سے وہ افراد جو ذاتی مفاد کے لیے توہین مذہب کے غلط الزامات لگاتے ہیں تک ہوتی ہے۔ معاشرے کا ایک طبقہ مطالبہ کرتا ہے کہ توہین مذہب کے قوانین پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس سے بدسلوکی سے بچا جا سکتا ہے۔ تقریبا تمام قاتل دلیل دیتے ہیں کہ مقتول نے مذہب کے خلاف ناقابل معافی جرم کیا ہے اور وہ واجب القتل تھا، یہ شدید متنازع جملہ ہے جیسے غلط ترجمہ کرتے ہوئے اس کے معنی قتل کر دینے کے قابل کر دیے گئے ہیں۔ رپورٹ میں اخباروں میں شائع ہونے والے توہین مذہب سے متعلق تشدد واقعات، متاثرین، مجرموں، قانون نافذ کرنے والوں کے کردار اور الزامات کی تعداد کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ریاست دلیل دیتی ہے کہ وہ افراد جو توہین مذہب کے نام پر قتل کرتے ہیں انہیں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔



رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ توہین مذہب کے قوانین 1860 میں انگریزوں کے دور میں بنائے گئے تھے۔ ابتدائی طور پر 1927 میں تعزیرات ہند کے تحت توہین مذہب کے قوانین 295، 296، 297 اور 298 متعارف کروائے گئے، بعدازاں مسلم کارپینٹر علم الدین کے کیس کے بعد شق 295 میں ایک اور شق ضمنی شک 295 اے شامل کی گئی۔ علم الدین نے توہین مذہب سے متعلق کتاب شائع کرنے پر مہاشے راجپال کو قتل کیا تھا۔ ہجوم کے ہاتھوں شہری کی ہلاکت کا یہ واقعہ سنیچر 12 فروری کی شب سات بجے کے

قریب ضلع خانیوال کی تحصیل میاں چنوں میں پیش آیا۔عینی شاہدین کے مطابق 17 والاموڑ نامی گاں کے باہر موجود مسجد سے مغرب کی نماز کے بعد نمازیوں کے نکل جانے کے بعد شور کی آوازیں آئیں۔گاں 17 والاموڑ سے تعلق رکھنے والے ایک شہری محمد رزاق (فرضی نام) نے اردو نیوز کو بتایا کہ یہ شخص صبح سے اس گاں میں موجود تھا اور بھیک مانگ رہا تھا کبھی غائب ہو جاتا کبھی پھر آ جاتا۔کچھ لوگوں نے اسے مالٹے کھاتے بھی دیکھا۔اس سے پہلے یہ کبھی ادھر نظر نہیں آیا تھا۔انہوں نے بتایا کہ شام کے بعد یہ شخص مسجد سے تھوڑی دور ایک دکان پر گیا اور وہاں کچھ دیر بیٹھا رہا اور اس نے دکان دار سے پوچھا کہ کیا اس کے پاس آگ کا انتظام ہے کیونکہ اسے سردی لگ رہی ہے۔دکاندار نے اسے بتایا کہ وہ دکان بند کر کے جا رہا ہے اور آگ نہیں ہے۔ تو یہ شخص بھی وہاں سے نکل گیا۔اس کے بعد اس کو مسجد کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا۔محمد رزاق کے مطابق اس کے مسجد کے اندر جانے کے کوئی دس منٹ بعد مسجد سے دھواں نکلتے دیکھا گیا۔کچھ لوگ مسجد کے اندر گئے تو اس شخص کو مارتے ہوئے باہر لائے۔ہمیں نہیں پتا کہ اندر کیا ہوا لیکن اس پر تشدد کرنے کے بعد اس کو مسجد کے اندر ہی بند کر دیا گیا۔اس کے بعد لوگوں کی ایک بڑی تعداد مسجد کے باہر اکھٹی ہے گئی اور اسی دوران پولیس کو بھی 15 پر اطلاع کر دی گئی۔عینی شاہدین کے مطابق ابتدائی طور پر صرف تین پولیس ہو اہلکار تھانہ تلمبہ (قریب ترین قصبہ) سے پہنچے۔پھرا ہجوم دیکھ کر انھوں نے مزید نفری منگوائی۔تھانہ صدر





خانیوال کے ایس ایچ او اقبال شاہ بھی نفری کے ہمراہ وہاں پہنچے تو ہجوم نے ان پر بھی حملہ کر دیا۔ اردو نیوز سے بات کرتے ہوئے اقبال شاہ نے بتایا کہ ہمیں وائرلیس پر اطلاع ملی کہ 17 والا موڑ میں لوگ کسی شخص کو مار رہے ہیں۔ میں نفری لے کر وہاں پہنچا تو سینکڑوں کی تعداد میں مشتعل لوگ موجود تھے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ مسجد میں بند شخص کو کسی طریقے سے نکال لیا جائے۔ اس وقت تک اس کی شناخت کا بھی کسی کو پتا نہیں تھا۔ لیکن میری یہ کوشش ناکام ہوئی اور ہجوم نے مجھ پر بھی حملہ کر دیا۔ مجھے اہلکاروں نے ہجوم کے چنگل سے نکالا۔ انہوں نے بتایا کہ پولیس کی مزید نفری کی ضرورت تھی لیکن مزید نفری کے آنے سے پہلے ہجوم نے اس شخص کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی لاش کو درخت پر لٹکا دیا۔ تھانہ تلمبہ کے ایس ایچ او منور گجر کے مطابق رات 11 بجے کے قریب اس شخص کی شناخت مشتاق کے نام سے ہوئی۔ اس کے بعد ہم نے ان کے گھر والوں سے رابطہ کیا اس کے بھائی ذوالفقار کو بلا کر شناخت کروائی اور ایف آئی آر کا اندراج کیا گیا۔ خیال رہے کہ پولیس نے اس واقعے کی دو ایف آئی آر درج کی ہیں ایک مقدمہ مقتول مشتاق پر درج کیا گیا ہے جس میں ان پر توہین مذہب کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ جبکہ دوسرا مقدمہ پولیس نے ان کے قتل کا ایس ایچ او کی مدعیت میں درج کیا ہے جس میں انسداد دہشت گردی کی دفعات بھی لگائی گئی ہیں۔ اردو نیوز سے بات

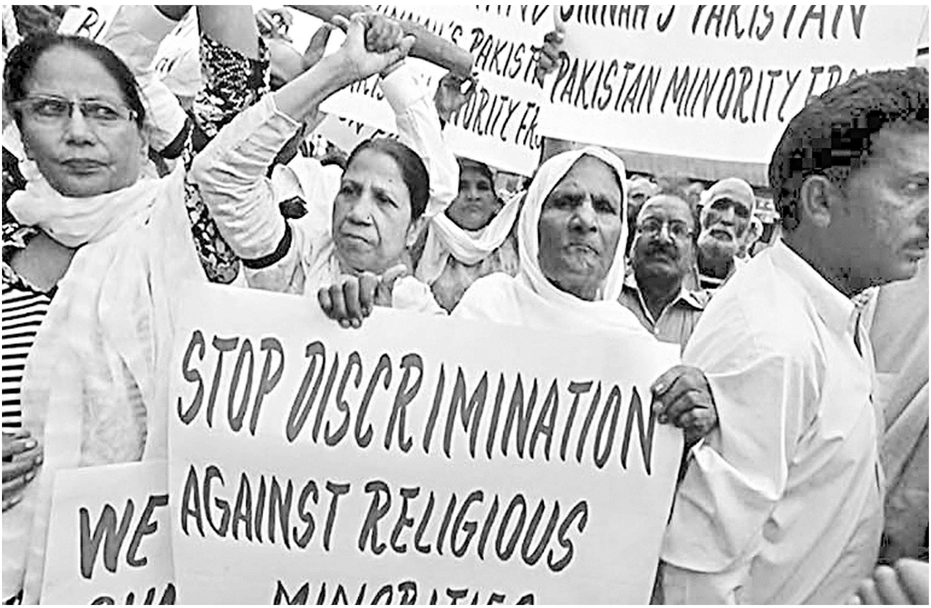
کرتے ہوئے مقتول کے بھائی نے بتایا کہ مشتاق ذہنی مریض تھے اور ہمیں ہر وقت ان کی فکر لاحق رہتی تھی۔ان کے دو بیٹے ہیں۔ بھائی کی ذہنی صحت خراب ہونے کی وجہ سے طلاق ہو چکی تھی۔ہم نے ان کا علاج کروانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ صحت یاب نہیں ہو سکے۔ہم نے ان کی صحت سے متعلق پورا ریکارڈ بھی پولیس کے حوالے کیا ہے۔ ہمارے بھائی کے ساتھ بہت زیادتی کی گئی ہے۔ پاکستان میں توہین مذہب کے الزام میں ہجوم کے ہاتھوں ہلاکت کا یہ واقعہ کوئی نیا نہیں۔گزشتہ چند مہینوں میں پیش آنے والا یہ دوسرا واقعہ ہے۔گزشتہ سال دسمبر میں پنجاب کے ہی شہر سیالکوٹ میں ہجوم نے سری لنکن شہری پر یانتھا کمارا جو ایک فیکٹری میں مینیجر تھے ان پر توہین کا الزام لگا کر نہ صرف انہیں تشدد کر کے ہلاک کیا گیا بلکہ ان کی لاش کو بھی جلا دیا گیا تھا۔ پولیس کے مطابق اس کیس کے تمام مرکزی ملزم گرفتار ہیں جبکہ مقدمے کا چالان بھی عدالت میں پیش کر دیا گیا اس کا ٹرائل ہونا ابھی باقی ہے۔ضلع خانیوال میں پیش آنے والے حالیہ واقعے اور سیالکوٹ واقعہ میں کئی قدریں مشترک ہیں۔ دونوں واقعات میں پولیس کے اہلکار موقع واردات پر موجود تھے لیکن وہ ہجوم سے بات چیت کرنے سے قاصر تھے۔اسی طرح دونوں واقعات میں قتل کرنے کے باوجود لاشوں کی بے حرمتی کی گئی۔عینی شاہدین کے مطابق جب مشتاق کو قتل کیا گیا تو مشتعل ہجوم میں لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے مختلف آوازیں بلند ہوئیں۔ پولیس نے جس طرح سے واقعے میں ملوث ملزمان کو گرفتار کیا وہ بھی سیالکوٹ واقعہ کے ملزمان کی گرفتاری سے مماثلت رکھتا ہے۔ پولیس کے مطابق تمام مرکزی ملزمان کو ان کے موبائل فونز سے بنائی گئی فوٹیجز سے شناخت کر کے ہی گرفتار کیا گیا ہے۔تابیتا گل مسیحی خاتون ہیں جو کہ کراچی کے سرکاری ہسپتال میں بطور نرس فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔ 28 جنوری 2021 کو معمول کے مطابق ہسپتال میں وہ اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھیں کہ اچانک کچھ لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا۔حملہ آوروں نے لاتوں، گھونسوں، مکوں اور جوتوں سے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا۔اس تمام معاملے کی باقاعدہ عکس بندی کی گئی اور یہ ویڈیو کلپس اسی دن ہی وائرل کر دیے گئے۔تابیتا گل پر تشدد کرنے والوں نے الزام عائد کیا کہ مذہبی عقائد کی توہین کی ہے جس پر تابیتا گل کے خلاف کراچی کے تھانہ آرام باغ میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295 سی کے تحت مقدمہ درج کر لیا گیا۔ جب تابیتا گل پر تشدد کیا جا رہا تھا تو بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ میں نے کسی کے مذہب کی توہین نہیں کی، میں بے گناہ ہوں مگر اس کے باوجود مقدمہ درج ہونے اور تفتیش

سے قبل ہی اسے سزا وار قرار دے کر تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ بعد ازاں تفتیش کے بعد الزامات غلط ثابت ہوئے جس پر تابیتا گل کو رہا کر دیا گیا اور اسے بھی جان کے تحفظ کے لئے بیرون ملک پناہ لینا پڑی۔ جائے ملازمت (workplace) پر کسی غیر مسلم کو توہین مذہب کے الزام کے تحت تشدد کا نشانہ بنائے جانے کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ ماضی میں ایسے بہت سے واقعات رپورٹ ہو چکے ہیں اور اب بھی تواتر سے ہو رہے ہیں۔ نرس تابیتا گل پر تشدد کا واقعہ منظر عام پر آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد فیصل آباد کے ڈسٹرکٹ ہسپتال میں بھی ایسا ہی واقعہ سامنے آیا تھا جس میں ہسپتال کی دو نرسوں پر توہین مذہب کا الزام عائد کر کے انہیں وارڈ میں بند کر دیا گیا تھا اور ہسپتال کے ایک ملازم نے چھری سے ان پر حملہ بھی کیا تھا۔ بعد ازاں کئی گھنٹے محبوس رکھنے کے بعد ہسپتال کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی مدعیت میں نرسوں کے خلاف زیر دفعہ 295 سی تھانہ سول لائنز میں مقدمہ درج کر لیا گیا۔ 1984 کے بعد سے اب تک 280 احمدیوں کو قتل کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے 170 ایسے ہیں جو صرف پچھلے دس سالوں میں ہلاک ہوئے ہیں۔ 69 فیصد ہلاکتیں صرف صوبہ پنجاب میں ہوئی ہیں۔ اس عرصے کے دوران احمدیوں پر 379 حملے ہوئے جبکہ 27 عبادت گاہوں کو تباہ اور 33 کو بند کیا گیا۔

پاکستان میں احمدیوں کی نسل کشی ہو رہی ہے:

یوں تو پاکستان میں بسنے والی کم و بیش تمام ہی اقلیتی برادریوں کو مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تاہم احمدی برادری کی حالت کچھ زیادہ ہی دگرگوں ہے۔ پاکستان کی ریاست، حکومتیں، نصاب، عدم برداشت اور سوشل میڈیا سمیت کئی محرکات ہیں جنہوں نے اس برادری کے خلاف نفرت انگیز فضا کی تخلیق میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے کچھ عرصے میں پاکستان میں احمدی برادری سے تعلق رکھنے والے افراد پر حملوں اور ان کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچانے کے واقعات میں خاصا اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ احمدی کمیونٹی کے قبرستانوں پر حملے کر کے ان کی قبروں کی بے حرمتی کی بھی اطلاعات آ رہی ہیں۔ بعض واقعات میں توڑ پھوڑ اور بے حرمتی کی یہ کارروائی پولیس کی موجودگی میں سر انجام پاتی ہے۔ اس

قسم کے اکثر وبیش تر واقعات پر ریاست خاموش رہتی ہے اور مجرموں کو کسی قسم کی سزا نہیں دی جاتی۔ احمدی برادری کے ساتھ پاکستان میں جس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے اس کے محرکات جاننے کے لئے تاریخ میں جھانکنا پڑے گا۔ 1953 میں مجلس احرار کی جانب سے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی تحریک شروع ہوئی اور لاہور سمیت مختلف شہروں میں بڑے پیمانے پر دنگے پھوٹ پڑے۔ ان فسادات کے حوالے سے بننے والے تحقیقاتی کمیشن کے سامنے روزنامہ زمیندار کے مدیر اور تحریک ختم نبوت کے اہم رہنما مولانا اختر علی خان نے بیان ریکارڈ کروایا تھا کہ فسادات وزیر اعلی ممتاز دولتانہ کے کہنے پہ شروع ہوئے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وزیر اعلی پنجاب چاہتے تھے کہ فسادات کا رخ پنجاب کی صوبائی حکومت کے بجائے کراچی کی مرکزی حکومت کی جانب ہونا چاہیے اور یہ بھی کہ انہوں نے یہ فسادات پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان کو وزارت کے منصب سے ہٹوانے کے لئے شروع کروائے تھے۔ سر ظفر اللہ خان کا تعلق احمدی برادری سے تھا۔ ممتاز دولتانہ کی حکومت نے اردو پریس خاص طور پر روزنامہ زمیندار کو احمدیوں کے خلاف خبریں چھاپنے اور نفرت انگیز فضا ہموار کرنے کے لئے بھرپور انداز میں استعمال کیا۔ 30 جون 1974



کو مولانا مفتی محمود نے قومی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا جس کے بعد مولانا مفتی محمود کو قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیے جانے والی کمیٹی کا سربراہ بنا دیا گیا۔قومی اسمبلی میں اس نوعیت کے چھ بل پیش ہوئے اور دو ماہ کی بحث و تمحیص کے بعد 6 ستمبر 1974 کو دوسری آئینی ترمیم کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اسے پیپلز پارٹی حکومت کا عظیم کارنامہ قرار دیا۔ضیا الحق کے امتناع قادیانیت آرڈیننس نے احمدیوں کے خلاف نفرت کو کئی گنا بڑھا دیا۔جنرل ضیا الحق نے احمدی برادری سے متعلق مزید سخت قوانین متعارف کروائے۔انہوں نے 26 اپریل 1984 کو امتناع قادیانیت آرڈیننس نافذ کیا جس کے تحت قادیانیوں کو مسلمانوں سے مختلف شناخت اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 278 سی اور 298 بی کے تحت اب جماعت احمدیہ کا کوئی رکن خود کو مسلمان ظاہر کرے، اپنی عبادت گاہوں کے لیے کوئی اسلامی اصطلاح استعمال کرے، السلام علیکم کہے یا بسم اللہ پڑھے، اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہے یا اذان دے تو اسے تین برس قید کی سزا ہو سکتی ہے۔سپریم کورٹ آف پاکستان نے 2014 میں از خود نوٹس لینے کے بعد ایک تاریخی فیصلہ دیا جس میں احمدی برادری کی عبادت



گاہوں کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لئے ایک ٹاسک فورس بنانے کی ہدایت کی گئی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ ان عبادت گاہوں کی مسماری کو سنگین جرم قرار دیا گیا تھا مگر اس حکم نامے کے باوجود احمدی کمیونٹی کی عبادت گاہوں کو مسلسل نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ 27 جولائی 2020 کو لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے پنجاب حکومت کے محکمہ داخلہ کو ایک خط لکھا اور گزارش کی کہ قربانی چونکہ سنتِ ابراہیمی اور سنتِ محمدی ہے جو کہ خاتم النبیین ہیں لہٰذا قربانی کی رسم انہی شعائرِ اسلامی میں آتی ہے جن کو اپنانے کا آئین کے تحت احمدیوں کو حق حاصل نہیں ہے۔اس لئے احمدیوں کو قربانی کی سنت ادا کرنے سے منع کیا جائے۔ضیاالحق کے امتناع قادیانیت آرڈیننس کے بعد معاشرتی سطح پر احمدی برادری کے خلاف عمومی نفرت بڑھی اور ان کے خلاف مقدمات میں اضافہ ہونے لگا۔اس کے بعد سے معاشرتی سطح پر احمدیوں کے خلاف غم و غصے کا اظہار کئی شکلوں میں سامنے آتا رہا ہے۔ بعض اوقات انفرادی طور پر احمدی برادری سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کو حملہ کر کے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔کبھی ان کے گھروں پر حملہ ہوتا ہے۔





احمد کی عبادت گاہوں پر تو تواتر کے ساتھ حملے ہوتے رہتے ہیں جبکہ بے شمار واقعات میں ان کی قبروں کی بے حرمتی بھی کی جاتی رہی ہے۔ جماعت احمدیہ کے ترجمان سلیم الدین بتاتے ہیں کہ یکم مئی 1984 کے بعد سے اب تک 280 احمدیوں کو قتل کیا جا چکا ہے۔ان میں سے 170 ایسے ہیں جو صرف پچھلے دس سالوں میں ہلاک ہوئے ہیں۔ 69 فیصد ہلاکتیں صرف صوبہ پنجاب میں ہوئی ہیں۔اس عرصے کے دوران احمدیوں پر 379 حملے ہوئے جبکہ 27 عبادت گاہوں کو تباہ اور 33 کو بند کیا گیا۔احمدیہ عبادت گاہوں پر سب سے خوفناک حملہ لاہور میں ہوا۔ 28 مئی 2010 کو یوم تکبیر کے موقع پر لاہور کے علاقوں ماڈل ٹاؤن اور گڑھی شاہو میں احمدیہ برادری کی دو عبادت گاہوں حملے کیے گئے جن کے نتیجے میں 87 کے قریب احمدی ہلاک جبکہ 100 سے زیادہ زخمی ہو گئے اور عبادت گاہوں کو شدید نقصان پہنچا۔ پاکستان کی تاریخ میں احمدی عبادت گاہوں پر یہ سب سے بڑے حملے تھے۔ 2019 میں سیالکوٹ کے چھتی بازار میں احمدیہ کمیونٹی کی عبادت گاہ کو تحریک لبیک اور دیگر مذہبی تنظیموں کے کارکنان نے مل کر مسمار کر دیا تھا۔جولائی 2020 میں تاری گری گوجرانوالہ کے احمدی قبرستان میں پولیس نے 60 سے زائد قبروں پر لگے کتبے توڑ دیے تھے۔دسمبر 2020 میں شیخوپورہ کے شاہ مسکین احمدی قبرستان میں 40 کے قریب قبروں کے منارے توڑے گئے اور قبروں کو نقصان پہنچایا گیا۔جنوری 2021 میں ننکانہ صاحب کے علاقے کوٹ دیالداس میں ایک مقامی شخص کی درخواست پر احمدی عبادت گاہ پر تعمیر کردہ میناروں کے خلاف پولیس نے کارروائی کی اور پوری عبادت گاہ کو مسمار کر دیا۔جنوری 2021 میں تھانہ شرقپور شریف کی حدود میں احمدی قبروں کی بے حرمتی کے خلاف درخواست جمع کرائی گئی۔قبروں کی بے حرمتی پر کارروائی کرنے کے بجائے پولیس نے الٹا احمدی کمیونٹی کے درجنوں افراد کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔اپریل 2022 میں مظفر گڑھ کے علاقے چوک سرور میں مشتعل ہجوم نے پولیس کی موجودگی میں احمدی عبادت گاہ کے مینار اور محراب مسمار کر دیے۔ 4 جون 2022 کو جہلم میں پنڈ دادن خان کے مقام پر احمدی عبادت گاہ کے مینار توڑے گئے۔ 20 نومبر 2022 کو ضلع فیصل آباد کے چک نمبر 89 ج ب رتن میں احمدیوں کی قبروں کی بے حرمتی کی گئی۔ پولیس نے مذکورہ واقعے کی ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کر

دیا۔ 7اور 8دسمبر 2022 کی درمیانی رات کو گوجرانوالہ کے علاقے باغبانپورہ میں پولیس کی جانب سے احمدی عبادت گاہ کے دو مینار مسمار کر دیے گئے۔ پولیس نے رات کی تاریکی میں گلی کی لائٹیں بند کر کے یہ آپریشن مکمل کیا۔ 10اور 11جنوری 2023 کی رات کو وزیر آباد شہر کے موتی بازار میں 108 سال پرانی احمدی عبادت گاہ کے میناروں کو پولیس نے مسمار کر دیا۔ 18جنوری 2023 کو دن دیہاڑے چند شر پسند افراد مارٹن روڈ کراچی پر واقع جماعت احمدیہ کی عبادت گاہ میں سیڑھی لگا کر داخل ہو گئے اور دو میناروں کو نقصان پہنچایا۔ پولیس کے آنے پر حملہ آور سیڑھی اور ہتھوڑا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ 21 جنوری 2023 کو ضلع سیالکوٹ کے چک پیرو میں ایک 75 سالہ احمدی خاتون وفات پا گئیں تو مقامی مشترکہ قبرستان میں ان کی تدفین کی اجازت نہ دی گئی۔ اس واقعے میں بھی پولیس نے حسب روایت احمدیوں کو مجبور کیا کہ میت کہیں اور لے جا کر دفن کر دیں۔ جس پر اس خاتون کی تدفین 250 کلومیٹر دور واقع ربوہ کے قبرستان میں لے جا کر کرنا پڑی۔ 22جنوری 2023 کی آدھی رات کو کچھ نامعلوم شر پسندوں نے ضلع فیصل آباد کے چک نمبر 89ج ب رتن میں احمدیوں کی قبروں کی بے حرمتی کی۔ شر پسند عناصر خاردار تاریں کاٹ کر احمدی قبرستان میں داخل ہوئے اور قبروں کی توڑ پھوڑ کی۔ اس کے بعد انہوں نے تابوتوں اور کچھ دیگر اشیا کو بھی آگ لگانے کی کوشش کی۔ 2فروری 2023 کو سہ پہر کے وقت کراچی کے علاقے صدر میں احمدیہ ہال کے مینار شر پسند عناصر نے مسمار کر دیے۔ اگرچہ احمدیہ ہال کے میناروں سے متعلق مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے مگر اس روز پانچ سے دس شر پسند آئے جن میں سے چار افراد دیوار کے اوپر چڑھ گئے اور ہتھوڑوں سے مینار توڑ دیے۔ نیچے کھڑے دیگر شر پسندوں نے جماعت احمدیہ کے خلاف نعرے لگائے۔ ان حملہ آوروں کا تعلق تحریک لبیک پاکستان سے بتایا گیا ہے۔ 3فروری 2023 کی رات کو چند افراد میر پور خاص کے علاقے گوٹھ غازی خان مرانی میں قائم احمدی عبادت گاہ میں دیوار پھلانگ کر داخل ہو گئے اور عبادت گاہ کے مینار توڑ دیے۔ اس کے بعد انہوں نے برآمدے میں آگ لگا دی۔ 3فروری ہی کی رات کو ضلع عمر کوٹ کے علاقے نور نگر میں احمدیوں کی عبادت گاہ بیت الذکر پر پٹرول چھڑک کر نذر آتش کر دیا گیا جس سے عبادت گاہ کے ہال میں موجود تمام

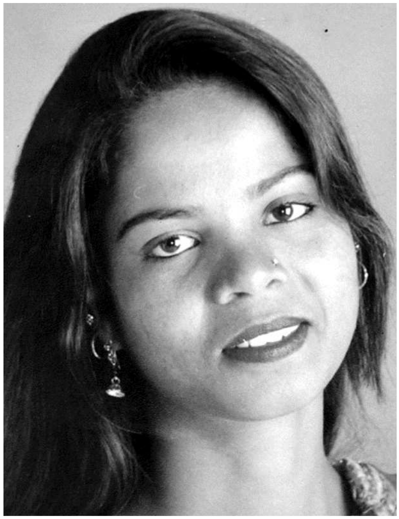
صفیں اور کرسیاں وغیرہ جل گئیں۔ 4 فروری 2023 کی رات کو میر پور خاص شہر میں سیٹلائٹ ٹاؤن کے علاقے میں نامعلوم افراد نے احمدیہ عبادت گاہ پر فائرنگ کر دی۔ فائرنگ کے وقت مقامی صدر اور کمیونٹی کے دیگر افراد عبادت گاہ میں موجود تھے تاہم وہ فائرنگ سے محفوظ رہے۔ عدم تحفظ کے احساس نے بڑے پیمانے پر احمدیوں کو پاکستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 1998 سے 2017 کے دوران ملک میں احمدیوں کی آبادی میں 35 فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔ 1998 کی مردم شماری کے مطابق ملک میں احمدیوں کی تعداد 2 لاکھ 91 ہزار 1 سو 75 افراد پر مشتمل تھی جبکہ 2017 کی مردم شماری کے مطابق یہ تعداد 1 لاکھ 91 ہزار 7 سو 37 افراد رہ گئی ہے۔ بعض بین الاقوامی اداروں کے مطابق پاکستان میں احمدیوں کی تعداد اس سے قدرے زیادہ ہے کیونکہ بعض احمدی خوف کی وجہ سے اپنا اندراج کروانے سے گھبراتے ہیں۔ جماعت احمدیہ کے ترجمان بتاتے ہیں کہ فی الحال پاکستان میں احمدی برادری کی آبادی 4 سے 5 لاکھ کے بیچ ہے۔ احمدی برادری کے بارے میں پائی جانے والی نفرت اور ان کے خلاف بڑھتے ہوئے حملوں کی سب سے بڑی وجہ حکومتی رویہ ہے۔ احمدی برادری پر جب کوئی حملہ کیا جاتا ہے تو ریاست کی جانب سے اس حملے کی کھل کر مذمت نہیں کی جاتی۔ بعض حکومتی نمائندے اس معاملے میں مکمل طور پر بے بس نظر آتے ہیں جبکہ بعض دیگر اس نفرت کو بڑھاوا دینے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ وفاقی وزیر برائے انسانی حقوق ریاض حسن پیرزادہ پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر اپنی بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دن دیہاڑے احمدیوں پر حملے کر کے انہیں قتل کیا جا رہا ہے، ان کی عبادت گاہوں پر حملے کیے جا رہے ہیں اور انہیں کوئی روکنے والا نہیں۔ ہمارے ملک میں عدم برداشت کا ماحول بنانے میں ہمارے ادارے اور محافظ ملوث ہیں۔ سابق وزیر اعلیٰ پنجاب پرویز الٰہی ایک میڈیا ٹاک میں کہتے ہیں کہ وہ عنقریب بہت بڑی مسجد بنا رہے ہیں جس کے باہر لکھا ہو گا کہ قادیانیوں کا داخلہ منع ہے۔ مارچ 2022 میں پاکستان تحریک انصاف کی پنجاب حکومت نے وزیر اعلی عثمان بزدار کی سربراہی میں نکاح نامے میں ایک شق شامل کرنے کی منظوری دی جس کے تحت نکاح نامے کے ساتھ ختم نبوت پر ایمان رکھنے کا حلف نامہ بھی جمع کروانا ضروری قرار دیا گیا۔ پاکستان کا قانون،

پارلیمنٹ کے آرڈی ننس اور عدلیہ کے فیصلوں کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو وہ احمدیوں کے خلاف موجودہ رویے کو بڑھاوا دینے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ احمدیوں کو بلاسفیمر اور غدار قرار دیا جاتا ہے اور ان کے خلاف کی جانے والی کارروائیوں کو سماجی سطح پر خاصی پذیرائی ملتی ہے۔

تحریک لبیک احمدیوں کا قتل عام کرانے کی جانب گامزن

پاکستان میں تحریک لبیک کی پیدائش اور مختصر عرصے میں معاشرے میں اس کی نفوذ پذیری اس رویے کا ایک اہم مظہر ہے۔ ایک مسیحی خاتون آسیہ بی بی پر بلاسفیمی کا الزام لگا اور گورنر پنجاب سلمان تاثیر نے ان سے ملاقات کی۔ ملاقات میں انہوں نے بلاسفیمی سے متعلق قوانین کا از سر نو جائزہ لینے کی بات کہی۔ اس تجویز کو یہ رنگ دیا گیا کہ سلمان تاثیر توہین کے قوانین کو ختم کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ سلمان تاثیر کے خلاف نفرت پر مبنی بھرپور مہم چلی اور اسی نفرت انگیز ماحول میں ایک روز ان کے ذاتی سکیورٹی گارڈ ممتاز قادری نے انہیں قتل کر دیا۔ لاہور میں ایک مدرسے سے جڑے مذہبی رہنما علامہ خادم رضوی نے سلمان تاثیر کو گستاخ قرار دیا اور ممتاز قادری کو غازی قرار دیتے ہوئے ان کی حمایت میں سڑکوں پر آ گئے۔ خادم رضوی کے مقف اور انداز بیان کو خوب پذیرائی ملی۔ انہوں نے اس تحریک کو 2015 میں تحریک لبیک کا نام دیا اور اسے سیاسی جماعت کے طور پر رجسٹرڈ کروالیا۔ خادم رضوی کی تحریک لبیک نے آسیہ بی بی اور سلمان تاثیر کو ملعون قرار دیتے ہوئے بیانیہ بنایا کہ ملک میں بلاسفیمی کے قوانین کو مزید سخت کیا جانا چاہیے۔ پچھلے چند سالوں میں احمدی برادری، ان کی عبادت گاہوں اور قبرستانوں پر ہونے والے حملوں میں جو واضح طور پر اضافہ دیکھنے میں آیا ہے تحریک لبیک کا وجود میں آنا بھی اس کی اہم وجہ ہے۔ 2017 میں نواز شریف حکومت کے دور میں جب تحریک لبیک نے فیض آباد کے مقام پر دھرنا دیا تھا تو اس وقت کے اپوزیشن لیڈر عمران خان نے کہا تھا کہ ان کا دل چاہتا ہے وہ خود اس دھرنے میں شریک ہوں۔ شیخ رشید نے بھی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ تحریک لبیک کے مطالبات کو مانیں۔ بعد میں جسٹس قاضی فائز عیسی کی سربراہی میں کام کرنے والے تحقیقاتی کمیشن نے اس دھرنے کے پیچھے اہم فوجی اہلکاروں کے کارفرما ہونے کی بھی نشان دہی کی تھی۔ اس کے بعد

قرآن مجید کی بے حرمتی پر فرانس کے سفیر کو دربدر کرنے کے مطالبے پر 2021 کے شروع میں تحریک لبیک نے ملک گیر احتجاج شروع کر دیا۔ اس دوران پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ساتھ تصادم کے کئی واقعات بھی پیش آئے جن میں کئی پولیس اہلکار جاں بحق ہو گئے۔ احتجاج کے دوران بڑے پیمانے پر عوامی املاک کو نقصان پہنچایا گیا۔ ایک غیر معمولی واقعے میں تحریک لبیک کے حامیوں نے لاہور کے ایک پولیس سٹیشن پر حملہ کر کے پولیس عملے کو یرغمال بنالیا اور انہیں شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔ ماضی میں تحریک لبیک کی حمایت کرنے والی جماعت پاکستان تحریک انصاف اور ان کے سربراہ عمران خان اب بہت بری طرح



پھنس کے رہ گئے۔ ایک جانب وہ تحریک لبیک کے رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات کر رہے تھے اور دوسری جانب ان کے ساتھ سختی سے پیش آنے کے کھوکھلے دعوے کر رہے تھے۔ جب تحریک لبیک کسی طرح قابو میں آتی نظر نہ آئی تو 14 اپریل 2021 کو وزیر داخلہ شیخ رشید نے تحریک لبیک پاکستان کو کالعدم قرار دیتے ہوئے اس پر پابندی عائد کر دی۔ اس پابندی کے باوجود حکومت نے مذاکرات میں کالعدم تنظیم کے کم و بیش تمام مطالبات مان لیے جن کے تحت تحریک کے تمام گرفتار کارکنوں کو فوری طور پر رہا کر دیا گیا۔ اس طرح پی ٹی آئی حکومت نے تحریک لبیک کے ہاتھوں بلیک میل ہونے کی بدترین مثال قائم کی۔ اسی تحریک لبیک کے حامیوں نے دسمبر 2021 میں توہین مذہب کا الزام لگا کر سیالکوٹ میں ایک سری لنکن شہری پریانتھا کمار کو دن دیہاڑے بے دردی سے ہلاک کر دیا اور ان کی لاش کو نذر آتش کر دیا گیا۔ 3 دسمبر 2021 کو سیالکوٹ کی ایک فیکٹری کے مینجر پریانتھا کمارا کو توہین مذہب کا الزام لگا کر بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا اور ان کی لاش کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ریاست اور حکومتیں تحریک لبیک جیسی جماعتوں کے سامنے آج بھی اسی طرح بے بس نظر آتی ہیں جیسے 1953 میں تھیں۔ ریاست اور حکومتوں کا یہی معذرت خواہانہ رویہ ایسی تحریکوں کے پھلنے پھولنے میں اہم

کردار ادا کرتا ہے۔ ریاستی بے بسی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ حاضر سروس آرمی چیف کے بارے میں جب یہ مشہور کر دیا جاتا ہے کہ وہ احمدی ہیں تو انہیں بھی عدم تحفظ کا احساس گھیرے میں لے لیتا ہے اور انہیں اپنے گھر پر محفل میلاد منعقد کروا کر یقین دلانا پڑتا ہے کہ وہ ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ریاستی کمزوری کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ عقیدے کے باعث ایک نوبیل انعام یافتہ سائنس دان کا نام تک لینا پاکستان میں برا سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام پہلے پاکستانی ہیں جنہیں نظریاتی فزکس کے میدان میں نوبیل انعام سے نوازا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کا تعلق احمدی برادری سے ہے اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں انہوں نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ تعصب کا یہ عالم ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کی کاوشوں کو پاکستان میں کسی فورم پر قابل ذکر نہیں گردانا جاتا اور انہیں مکمل بلیک آؤٹ کا سامنا ہے۔ پاکستان سے متعلق ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا تھا کہ ہمیں ایک گھر ورثے میں ملا ہے جس میں کھڑکیاں نہیں ہیں اور اس کی دیواریں بہت اونچی ہیں۔ ہمیں کبھی کبھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ گھر ہے یا جیل۔ ایک وقت تھا جب درسی کتابوں میں بھی 1965 اور 1971 کی جنگوں میں حصہ لینے والے احمدی ہیروز کا ذکر تصویروں کے ساتھ شامل تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ان تمام ہیروز کے نام تاریخ کی کتابوں سے غائب کر دیے گئے۔ میجر جنرل افتخار جنجوعہ، لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک، ایئر مارشل ظفر چودھری، لیفٹیننٹ جنرل عبدالعلی ملک، میجر افضال محمود شہید، سکواڈرن لیڈر خلیفہ منیر الدین احمد شہید اور دیگر متعدد افسر اور جوان ایسے ہیں جنہوں نے ان جنگوں میں فیصلہ کن معرکے سرانجام دیے مگر اب ان کا ذکر کہیں سننے کو نہیں ملتا۔ سوشل میڈیا کافی حد تک ہماری مجموعی معاشرتی سوچ کا عکاس بن چکا ہے اور ہمارے سوشل میڈیا پر پچھلے چند سالوں سے احمدی برادری کے خلاف نفرت انگیز مواد اور بحث مباحثوں میں نمایاں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ ہیومن رائٹس کمیشن کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں اس وقت سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر 53 فیصد نفرت انگیز گفتگو احمدی کمیونٹی کے خلاف کی جاتی ہے۔ سوشل میڈیا پر فتوے بھی جاری کیے جاتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ احمدیوں کا وجود بذات خود توہین آمیز ہے۔ اس طرح کے دعوں اور اعلانات سے بہت سے دیکھنے سننے والوں کو شہ ملتی ہے اور وہ احمدی افراد، ان کی عبادت گاہوں اور ان کے قبرستانوں پر حملے کرنے کو چڑھ دوڑتے ہیں۔ میرپور ماتھیلو میں توہین مذہب کے نام پر قتل کئے گئے دونوں بازوؤں سے معذور عباس کی والدہ سمیت

ان کے دیگر ورثا انصاف کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔عباس کی والدہ کا کہنا ہے ان کا بیٹا میلاد کی تیاریوں میں مصروف تھا، اسے غلط الزام لگا کر قتل کیا گیا ہے۔خیال رہے کہ ملزمان نے معذور نوجوان کو پہلے آگ لگائی، مقتول عباس نے خود کو بچانے کے لیے پانی میں چھلانگ لگائی، لیکن ملزمان نے بھی اس کے پیچھے پانی میں کودے اور اسے گلا دبا کر قتل کر دیا۔ورثا کا کہنا تھا کہ قاتلوں کا تعلق بھی ان کی ہی برادری سے ہے، ملزمان کا مذہب کے نام پر لڑائی جھگڑے کرنا وطیرہ ہے۔دوسری جانب پولیس کا کہنا ہے کہ ہم نے بروقت کارروائی کرتے ہوئے ایک ملزم کو گرفتار کر لیا پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے 17 جنوری کو قومی اسمبلی میں متفقہ طور پر منظور ہونے والے فوجداری قوانین (ترمیمی) ایکٹ 2023 پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔اگرچہ اس بل کا بیان کردہ مقصد فرقہ واریت کو روکنا ہے، تاہم، ایچ آر سی پی کا خیال ہے کہ اس سے پاکستان کی مشکلات میں گھری مذہبی اقلیتوں اور اقلیتی فرقوں پر ظلم و ستم میں اضافہ ہوگا۔مجوزہ قانون میں پیغمبر کے خاندان، ازواج مطہرات، صحابہ کرام اور چاروں خلفا سمیت مقدس ہستیوں کے خلاف توہین آمیز کلمات کی سزا تین سال سے بڑھا کر عمر قید کر دی گئی جبکہ کم از کم سزا دس برس کر دی گئی ہے۔اس بل نے جرم کو بھی ناقابلِ ضمانت بنا دیا ہے جو کہ آرٹیکل 9 کے تحت ذاتی آزادی کے آئینی طور پر ضمانت شدہ حق کی واضح خلاف ورزی ہے۔پاکستان میں اس طرح کے قوانین کے غلط استعمال کی تکلیف دہ تاریخ کے پیش نظر، خدشہ ہے کہ یہ ترامیم زیادہ تر مذہبی اقلیتوں اور فرقوں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال ہوں گی، اور نتیجے میں جھوٹی ایف آئی آرز، ہراسانی اور ظلم و ستم کو فروغ ملے گا۔مزید برآں، مبینہ توہینِ مذہب کی سزا میں اضافے سے ذاتی انتقام کے لیے قانون کے غلط استعمال میں اضافہ ہوگا، جیسا کہ اکثر توہین مذہب کے الزامات میں ہوتا ہے۔ایک ایسے وقت میں جب سول سوسائٹی ان قوانین کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے ان میں ترامیم کا مطالبہ کر رہی ہے، سزا میں اضافہ کرنا اس کے بالکل برعکس ہوگا۔پاکستان میں ایک ہندو ٹیچر کو توہین مذہب کے جرم میں عمر قید کی سزا سنائی گئی ہے۔ویسے پاکستان میں اقلیتوں کو جان بوجھ کر توہین رسالت کے مقدمات میں پھنسایا جاتا ہے۔اس میں خود کو بے قصور ثابت کرنا مشکل ہے۔خاص طور پر پاکستان جیسے ملک میں توہین مذہب کے مقدمات میں اکثر نچلی عدالتوں میں سزائیں سنائی جاتی ہیں۔لیکن اعلیٰ عدالت میں جانے کے بعد یہ معاملہ کئی بار خارج بھی ہو چکا ہے۔صرف پاکستان ہی نہیں کئی ممالک میں توہین مذہب کے قوانین

موجود ہیں۔ عام طور پر اکثر مسلم ممالک میں توہین رسالت کے حوالے سے قوانین بنائے گئے ہیں۔ اس میں عمر قید سے لے کر پھانسی تک کی دفعات ہیں۔ تاہم ماضی قریب میں پاکستان کے ساتھ ساتھ کئی ممالک میں توہین مذہب سے متعلق قانون کو ختم کرنے اور فیصلوں میں نرمی کے لیے آواز اٹھائی گئی ہے۔ آسیہ بی بی کا کیس گزشتہ چند سالوں میں پاکستان میں سب سے زیادہ زیر بحث رہا۔ اسے پاکستان کی نچلی عدالت اور ہائی کورٹ نے موت کی سزا سنائی تھی، لیکن سپریم کورٹ نے اسے پلٹ دیا اور اسے بے قصور قرار دیا۔ پھر سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف پورے پاکستان میں احتجاج کیا گیا۔ آسیہ پر پڑوسی خواتین نے پیغمبر اسلام



کی توہین کا الزام لگایا تھا۔ پاکستان میں جب بھی توہین رسالت کے حوالے سے عدالت کوئی فیصلہ دیتی ہے تو توہین رسالت کے قانون پر بحث بھی تیز ہو جاتی ہے۔ سال 1990 سے لے کر اب تک پاکستان میں 75 سے زائد افراد کو ہجوم یا لوگوں نے توہین مذہب کا الزام لگا کر قتل کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی 40 سے زائد افراد یا تو سزائے موت کے منتظر ہیں یا توہین مذہب کے قانون کے تحت سزا پانے کے بعد عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ پاکستان میں عموماً اس سزا کا شکار عیسائی اور احمدی برادری کے لوگ ہوتے رہے ہیں۔ بہت کم ہندوؤں کو ایسی سزا دی گئی ہے۔ پاکستان دنیا کا واحد ملک نہیں جہاں توہین رسالت کے حوالے سے قوانین

موجود ہیں۔ دنیا کے 26 فیصد ممالک میں توہین مذہب سے متعلق قوانین موجود ہیں جن کے تحت سزا کی دفعات موجود ہیں۔ ان میں سے 70 فیصد ملک مسلم اکثریتی ہے۔ سعودی عرب، ایران اور پاکستان میں اس جرم کے لیے سزائے موت کا پروویژن ہے۔ مذہب متعلق فوجداری مقدمات سب سے پہلے برطانوی دور حکومت میں 1860 میں مرتب کیے گئے تھے اور 1927 میں ان کی توسیع کی گئی تھی۔ پاکستان میں ضیا الحق کی فوجی حکومت کے دوران 1980 سے 86 کے درمیان اس میں مزید دفعات شامل کی گئیں۔ وہ ان کو اسلامائز کرنا چاہتے تھے اور 1973 میں احمدی کمیونٹی کو غیر مسلم کمیونٹی قرار دیا گیا اور انہیں قانونی طور پر



بھی الگ کرنا چاہتے تھے۔ یہ برطانوی دور حکومت میں بنایا گیا عام قانون تھا۔ اس کے تحت اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کسی مقام یا عبادت گاہ کو نقصان پہنچاتا ہے یا مذہبی اجتماع میں خلل ڈالتا ہے تو اسے سزا دی جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی بول کر یا لکھ کر یا کچھ مناظر کے ذریعے کسی کے مذہبی جذبات کی توہین کرتا ہے تو اسے غیر قانونی تسلیم کیا گیا۔ اس قانون کے تحت ایک سے 10 سال تک کی سزا ہوسکتی ہے جس میں جرمانہ بھی عائد کیا جاسکتا ہے۔ 1980 کی دہائی کے اوائل میں، مذہبی معاملات سے متعلق جرائم کے لیے تعزیرات پاکستان میں کئی دفعات شامل کی گئیں۔ ان حصوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ جس میں پہلا

احمدی مخالف قانون اور دوسرا توہین رسالت کا قانون شامل تھا۔تب پاکستان پر آمر جنرل ضیاالحق کی حکومت تھی۔احمدی مخالف قانون 1984 میں شامل کیا گیا تھا۔اس قانون کے تحت احمدیوں کو اپنے آپ کو مسلمان سمجھنے یا ان جیسا سلوک کرنے اور اپنے مذہب پر عمل کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ 1980 میں ایک طبقے نے کہا تھا کہ اگر کوئی کسی اسلامی شخص کے خلاف توہین آمیز کلمات کہے تو اسے تین سال تک قید ہو سکتی ہے۔اسی دوران 1982 میں ایک اور طبقہ نے کہا کہ اگر کوئی شخص قرآن کی بے حرمتی کرے گا تو اسے عمر قید کی سزا دی جائے گی۔سال 1986 میں ایک الگ سیکشن کا اضافہ کیا گیا تھا،جس میں کہا گیا تھا کہ توہین رسالت کے جرم میں سزائے موت دینے یا عمر قید کی سزا تجویز کی گئی۔پاکستان میں انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے ایک اور شہری کو توہین مذہب کے الزام میں سزائے موت کا حکم سنا دیا ہے۔اس شہری پر الزام تھا کہ اس نے ایک واٹس ایپ گروپ میں توہین مذہب کا پیغام پوسٹ کیا تھا۔پشاور سے ہفتہ پچیس مارچ کو ملنے والی رپورٹوں کے مطابق ملزم کو اس کے خلاف مقدمے کی سماعت کے بعد سزائے موت کا حکم صوبے خیبر پختونخوا کی ایک عدالت نے جمعہ چوبیس مارچ کو سنایا۔بتایا گیا ہے کہ ملزم کو پشاور میں انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے یہ سزا انسداد دہشت گردی کے ملکی قانون اور الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کے پاکستانی قانون کے تحت سنائی۔عدالتی فیصلے کی خبر رساں ادارے اے ایف پی کو ملنے والی ایک نقل کے مطابق ملزم پولیس کی تحویل میں ہے اور اسے یہ سزا اس کے خلاف الزام ثابت ہو جانے اور مجرم قرار دیے جانے کے بعد سنائی گئی۔اسے سزائے موت کے علاوہ 12 لاکھ روپے جرمانے اور مجموعی طور پر 23 برس قید کی سزائیں بھی سنائی گئی ہیں۔اسے عدالتی فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا حق حاصل ہے۔اے ایف پی کے مطابق ملزم کے خلاف یہ مقدمہ اس وقت درج کیا گیا تھا،جب پاکستان کے ایک اور شہر سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے دو سال قبل وفاقی تحقیقاتی ادارے ایف آئی اے کو یہ درخواست دی تھی کہ ملزم مبینہ طور پر ایک واٹس ایپ گروپ میں توہین مذہب کا باعث بننے والا ایک پیغام پوسٹ کرنے کا مرتکب ہوا تھا۔اس درخواست کے بعد ملزم کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور ایف آئی اے نے اس کا موبائل فون قبضے میں لے کر فورینزک معائنے کے لیے بھیج دیا تھا۔سینٹر فار سوشل جسٹس (سی ایس جے) کی جانب سے تیار کردہ ہیومن رائٹس آبزرور 2022 کے عنوان سے رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ توہین مذہب کا ہر دوسرا ملزم مسلمان ہے۔رپورٹ کے

مطابق سال 2021 میں توہین مذہب کے الزام میں سب سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی، اس کے بعد احمدی، ہندو اور عیسائی تھے۔ ایکسپریس ٹریبیون کی رپورٹ کے مطابق اس تحقیق میں کہا گیا ہے کہ توہین مذہب کے تحت کل 84 افراد کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا تھا جن میں سے 42 افراد کے خلاف توہین مذہب کا الزام عائد کیا گیا تھا، جن میں سے 25 احمدی، سات ہندو اور تین عیسائی تھے۔ رپورٹ میں نہ صرف توہین مذہب کے اعداد وشمار کا احاطہ کیا گیا بلکہ لنچنگ کے واقعات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ میں لنچنگ کے تین واقعات شامل ہیں، جن میں سری لنکن شہری پریبنکا کمارا کی سیالکوٹ میں 2021 میں رپورٹ کی گئی بدنام زمانہ لنچنگ بھی شامل ہے۔ کمارا لنچنگ کیس میں ملزمین میں ایک خواجہ سرا اور چھ خواتین شامل ہیں۔ ان میں سے خواجہ سرا اور دو خواتین عقیدے کے اعتبار سے مسلمان ہیں جبکہ چار عیسائی تھے۔ پاکستان میں اقلیتوں اور یہاں تک کہ مسلم کمیونٹی کے ارکان کے خلاف توہین مذہب کے سخت قوانین کا غلط استعمال پاکستان میں بہت زیادہ ہے۔ پاکستان میں بہت سے لوگوں کو توہین مذہب کے الزام میں قتل کر دیا گیا ہے۔ ایکسپریس ٹریبیون نے رپورٹ کیا کہ لاتعداد دوسرے لوگ انصاف ملنے کی کوئی امید کے بغیر سالوں سے جیلوں میں پڑے ہیں کیونکہ وکلا، اپنی جان کے خوف سے، ان کا دفاع کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ نچلی عدالتوں میں ججز معمول کے مطابق شواہد کی جانچ کیے بغیر ملزم کو حتمی سزائے موت سناتے ہیں۔ حال ہی میں ملتان میں ایک ملزم کے وکیل کو قتل کر دیا گیا اور اس سے پہلے لاہور ہائی کورٹ کے ایک جسٹس کو ایک غلط الزام میں قید مسیحی شخص کو بری کرنے پر اس کے چیمبر میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی بھی ملک میں توہین مذہب کا کوئی واقعہ پیش آ جائے تو کوئی بھی مسلمان مذہب کی توہین کرنے والے کو اسے قانون کی طرف سے دی جانے والی سزا کا انتظار نہیں کرتا بلکہ اس انسان کو خود اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کرتا ہے، ایک سچا مسلمان اپنی زندگی میں مذہب کو اپنی ہر چیز حتی کہ اپنے خاندان اور اپنی سانسوں پر بھی ترجیح دیتا ہے وہ کسی صورت بھی مذہبی گستاخی برداشت نہیں کرتا، کچھ ایسے ہی واقعات پچھلے کچھ عرصے میں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی دیکھنے کو ملے۔ مارچ 2013 میں 7 ہزار افراد پر مشتمل مشتعل ہجوم نے بادامی باغ لاہور کی جوزف کالونی میں مسیحی برادری کے 150 گھروں، 18 دکانوں اور دو گرجا گھروں کو آگ لگا دی۔ واقعہ ایک مسیحی شہری پر توہین مذہب کے الزام کے بعد پیش آیا تحقیقات پر یہ

واقعہ ذاتی رنجش کا نتیجہ نکلا۔ پنجاب میں 2014 میں ایک مشتعل ہجوم نے ایک مسیحی جوڑے کو توہین مذہب کے الزام میں تشدد کر کے افسوسناک واقعہ پیش آیا جس میں جان سے مار ڈالا اور سفا کی سے ان کی لاش کو آگ لگادی۔ اپریل 2017 میں خیبر پختونخوا میں عبدالولی خان یونیورسٹی کے طالب علم مشعال خان کو اسی یونیورسٹی کے طلبہ نے توہین مذہب کا الزام لگا کر مشتعل ہجوم کی صورت میں بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا۔ یہاں تک کہ اس کی جان چلی گئی، تحقیقات میں توہین مذہب کے الزامات جھوٹے نکلے۔ نومبر 2020 میں خوشاب میں بینک منیجر کو گارڈ نے توہین مذہب کا الزام لگا کر گولی ماردی۔ میڈیا رپورٹس میں بتایا گیا کہ گارڈ نے یہ قتل ذاتی رنجش کی بنا پر کیا۔ اسی سال 2020 میں پاکستان مسلم لیگ ن کے رہنما خواجہ آصف کے خلاف بھی توہین مذہب کے جرم میں کیس فائل کیا گیا، خواجہ آصف نے نیشنل اسمبلی میں خطاب کے دوران اسلام اور دوسرے مذہب کو برابر قرار دیا تھا جس پر پاکستان تحریک انصاف کے رہنما قمر ریاض نے ان کے خلاف توہن مذہب کے جرم میں کیس کر دیا۔ ستمبر 2021 میں لاہور کورٹ نے اسکول پرنسپل سلمہ تنویر کو سزائے موت سنائی تھی، سلمہ تنویر نے لوگوں میں فوٹو کو پیز تقسیم کی تھی جس میں اس نے محمدؐ کے آخری نبی ہونے کا انکار کیا تھا۔ قانون





غلط استعمال ہو تو نتائج کا سامنا عوام کریں۔ پاکستان میں توہین مذہب کے قانون کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ کراچی ایئرپورٹ پر ایک مسیحی خاتون سیکیورٹی اہلکار کے ساتھ پیش آنے والا حالیہ واقعہ اس کی تازہ ترین مثال ہے۔ سول ایوی ایشن کی مسیحی ملازمہ ثمینہ مشتاق نے ڈوئچے ویلے کو بتایا کہ وہ اس ادارے کے شعبہ ویجیلنس سے تعلق رکھتی ہیں۔ گزشتہ ہفتے ان کے اپنے ہی ادارے کے ایک مسلمان ساتھی ملازم سلیم نے معمولی تکرار کے بعد ان پر توہین مذہب کا جھوٹا الزام عائد کر دیا۔ ثمینہ مشتاق نے ڈی ڈبلیو کو بتایا، گزشتہ جمعرات کو سلیم نے اپنے دوستوں کی ایک گاڑی ممنوعہ علاقے میں پارک کرنے کی کوشش کی، وہ بھی کلیئرنس والی گاڑیوں کے ممنوعہ علاقے میں۔ اس پر میں نے اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے اسے روکا تو اس نے مجھ پر توہین مذہب کا الزام عائد کر دیا۔ سلیم چلا رہا تھا اور اس کی آواز سن کر وہاں لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لہذا مجھے اندیشہ تھا کہ میرے ساتھ بھی ویسا ہی واقعہ پیش نہ آ جائے، جیسا سیالکوٹ میں ہوا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے موبائل فون سے ویڈیو ریکارڈنگ کرنا شروع کر دی تا کہ کسی بھی ناخوش گوار واقعے کی صورت میں میری بے گناہی ثابت ہو سکے۔ ثمینہ مشتاق نے اس واقعے کے بعد اپنے ادارے کے افسران کے رویے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کسی نے بھی ان کی خیریت

تک دریافت نہ کی بلکہ الٹا انہیں اس ادارے کے سوشل میڈیا گروپ سے بھی نکال دیا گیا۔ثمینہ مشتاق نے کہا کہ توہین مذہب کا قانون پاکستان میں مذہبی اقلیتیوں کے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار ہے،جس میں ترمیم کی جانا چاہیے۔

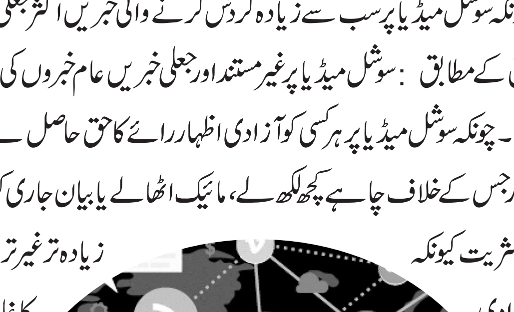
حل کیا ہے؟

انتہاپسندی ایک ایسا عالمی مسئلہ ہے، جو مذہب، مسلک، ثقافت اور سرحدوں کی حدود سے بالاتر ہے۔ یہ دراصل عدم برداشت، نفرت، لسانیت وجنونیت میں شدت کا نتیجہ ہے۔ جدید دور میں جدت کی وجہ سے معاشرے کی عام انتہاپسندی بھی جدید (آن لائن انتہاپسندی) میں بدل گئی ہے،جس میں سوشل میڈیا کا بہت بڑا کردار ہے۔ یکم جنوری، 1983 کو انٹرنیٹ کی ایجاد نے دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا اور ترقی کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد 1990 میں ورلڈ وائڈ ویب کی ایجاد سے مزید ترقی کرلی۔ 2004 کے بعد انٹرنیٹ کی دنیا میں کچھ ایسی سوشل سائٹس آئیں، جنہوں نے لوگوں کو ایک نئے دور میں داخل کردیا۔ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں 50 ملین سے زیادہ لوگ سوشل میڈیا اکاونٹس استعمال کررہے ہیں؟ جن میں سب سے زیادہ تعداد فیس بک استعمال کرنے والوں کی ہے، جو تقریبا 30 ملین سے زیادہ ہے۔

موشل میڈیا جہاں سماجی رابطے قائم کرنے، دوستوں اور عزیزوں کا آپس میں آن لائن میل جول کا ذریعہ اور ایک مضبوط مواصلاتی نظام ہے، وہیں آن لائن انتہاپسندی کے فروغ میں بھی اس نے بہت بڑا کردار ادا کیا۔ سوشل میڈیا کے ذریعے جھوٹی اور غلط خبریں پھیلانے کے ساتھ غیر اخلاقی اور نفرت انگیز مواد کو بھی شیئر کیا جاتا ہے؛ جس کی وجہ سے معاشرے میں انتہاپسندی کی شرح میں اضافہ ہورہا ہے اور آئے روز کوئی نیا واقعہ دیکھنے کو ملتا ہے۔میڈیا رپورٹس کے مطابق داعش (انتہاپسند تنظیم) سوشل میڈیا پر سب سے زیادہ متحرک ہے، جو اپنے پوسٹوں کے ذریعے سے نوجوانوں کو شدت پسندی پر اکسا کر معاشرے میں انتہاپسندی پھیلانے کا ذریعہ بن رہے ہے۔ مزید اپنے موضوع پر بات کرنے سے پہلے سوشل میڈیا کے ذریعے پھیلنے والی آن لائن انتہاپسندی کے عناصر کا تجزیہ کرتے ہیں (کہ وہ کون سے بنیادی عناصر ہیں جو آن لائن انتہاپسندی کے فروغ کا سبب بن رہے ہیں)۔سوشل میڈیا کے ذریعے آن لائن انتہاپسندی کے فروغ میں کردار ادا کرنے والے



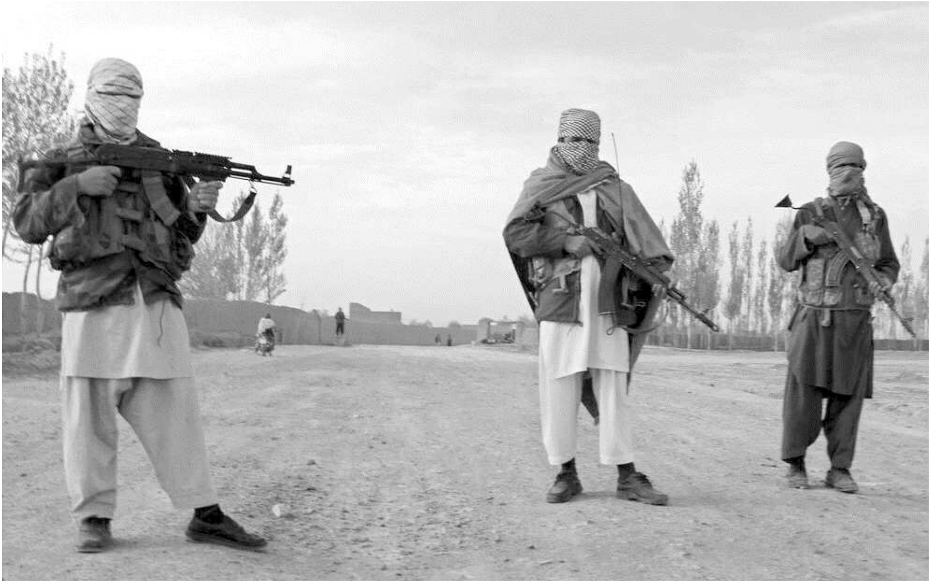
عناصر میں غیر مستند اور جھوٹی خبریں، غیر اخلاقی مواد، اور غیر مجاز صحافت بنیادی عناصر ہیں۔ یہاں ان (بنیادی) عناصر کا بالترتیب ایک جائزہ لیتے ہیں۔ سب سے پہلے غیر مستند اور جھوٹی خبروں کے بارے میں بات کرتے ہیں؛ کیونکہ سوشل میڈیا پر سب سے زیادہ گردش کرنے والی خبریں اکثر جعلی ہوتی ہیں۔ (ایم آئی ٹی کے محققین کی تحقیق کے مطابق : سوشل میڈیا پر غیر مستند اور جعلی خبریں عام خبروں کی نسبت دس فیصد زیادہ تیزی سے پھیلتی ہیں۔ چونکہ سوشل میڈیا پر ہر کسی کو آزادی اظہار رائے کا حق حاصل ہے اور ہر شخص جب چاہے، جیسے چاہے اور جس کے خلاف چاہے کچھ لکھ لے، مائیک اٹھا لے یا بیان جاری کرلے کوئی پوچھنے والا نہیں۔لیکن ہماری اکثریت کیونکہ زیادہ تر غیر تربیت یافتہ ذہنیت کے مالک ہیں، جو اس آزادی کا غلط استعمال کر کے غیر مستند اور جھوٹی خبریں جاری کرتے ہیں، جبکہ بعض شر پسند افراد اپنے مذموم مقاصد کی خاطر) جان بوجھ کر بھی ایسی خبریں جاری کرتے ہیں۔جن کو بلا تصدیق آگے شیئر کیا جاتا ہے۔ان من گھڑت اور جعلی خبروں کیوجہ سے





معاشرے میں غلط فہمیاں اور نفرتیں پیدا ہوتی ہیں، جو شدت اختیار کرنے کے بعد انتہا پسندی اور دہشتگردی کو جنم دیتا ہے۔ دوسرے نمبر پر غیر اخلاقی اور قابل اعتراض مواد پر بات کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر چونکہ مختلف قسم کے لوگ موجود ہیں، جن میں سے کچھ بگڑے ہوئے اور خراب ذہنیت کے مالک ہیں۔ یہ لوگ سوشل میڈیا پر غیر اخلاقی اور فحش مواد شیئر کر کے لوگوں (خاص کر نوجوانوں) کے جنسی جذبات کو ابھارتے ہیں؛ جس کی وجہ سے معاشرے میں جنسی ہراساں، جنسی زیادتی اور جنسی تشدد جیسے واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

آخر میں غیر مجاز صحافت پر بات کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا کہ سوشل میڈیا پر ہر کسی کو آزادی صحافت اور آزادی اظہار رائے (لکھنے اور بولنے) کا حق حاصل ہے، جس نے ہر شخص کو با اختیار بنا دیا ہے۔ سوشل صحافت کرنے والے چاہے صحافت کا الف بھی نہ جانتے ہوں لیکن اپنے آپ کو صحافی تصور کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر ایسے کئی لوگ اور پیجیز دیکھنے کو ملتے ہیں، جو غیر مجوز اور غیر تصدیق شدہ ہونے کے باوجود بلا جھجک صحافت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس غیر مجوز صحافت کی وجہ سے معاشرے میں غلط نظریات اور معلومات پھیل رہے ہیں، جو آن لائن انتہا پسندی کے فروغ کا سبب بن رہے ہیں۔ انتہا پسندی معاشرے کا ناسور ہے، جس کو سوشل میڈیا کے ذریعے سے کافی فروغ مل رہا ہے۔ سوشل میڈیا کا مکمل آزاد



استعمال (کھلے عام غیر اخلاقی سرگرمیاں، جعلی خبروں کی گردش، جعلی اکاونٹس اور پیجز، وغیرہ) کی وجہ سے آن لائن انتہا پسندی کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انتہا پسندی کی روک تھام کے لئے اس کے فروغ میں معاون اور ذریعہ بننے والے عناصر کے خلاف اگر مل کر سنجیدگی سے کام کیا جائے تو بہت حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔

ہجوم نما اس قوم کو انسانیت کا درس دینا ہوگا

انتہا پسندی دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے، آئے روز مختلف ممالک سے انتہا پسندی کے واقعات رپورٹ ہوتے ہیں مگر ایشیائی ممالک بالخصوص پاکستان، افغانستان، انڈیا اور بنگلہ دیش میں انتہا پسندی سے زیادہ جہالت دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً سیالکوٹ واقعہ ہماری معاشرتی جاہلیت اور دین اسلام سے لاعلمی کا عکاس ہے۔ آگ کے شعلے انسانیت کے تمام، تقاضوں کو جلا کر بھسم کر رہے تھے۔ گلہ کریں بھی تو کس سے؟ کیونکہ سچ سننے کی قوت بھی ہم میں نہیں رہی۔ اگر دیکھا جائے تو ملک کے طول و عرض میں لاکھوں مدارس اور مساجد قائم ہیں جہاں نہ صرف دین اسلام کی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ نرم مزاجی اور انسان دوستی کا درس بھی دیا جاتا ہے۔
یہ انتہا پسندی نا جانے کہاں سے ہمارے معاشرے کا حصہ بن گئی ہے؟ کچھ سیاستدان پاکستان کو ریاست

مدینہ بنانے کا عزم رکھتے ہیں لیکن انہیں جان لینا چاہیے کہ اس مقصد کیلئے انہیں سب سے پہلے انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے اقدامات کرنا ہوں گے۔ ہجوم نما اس قوم کو انسانیت کا درس دینا ہوگا۔ سیالکوٹ میں پیش آنے والے واقعہ میں ایک مشتعل ہجوم نے توہین مذہب کے الزام میں ایک غیر ملکی شہری کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی لاش کو آگ لگا دی تھی، جس کی وجہ سے پاکستان ایک دفعہ پھر عالمی سطح پر میڈیا کی شہ سرخیوں میں آ گیا۔ سیالکوٹ واقعہ میں ہلاک ہونے والا پریانتھا کمارا ایک سری لنکن شہری تھا، جو کہ سیالکوٹ میں ایک نجی فیکٹری میں بحیثیت جنرل منیجر خدمات انجام دے رہا تھا۔ اس واقعہ نے عالمی سطح پر پاکستان کے تشخص کو بہت نقصان پہنچایا ہے جس کے اثرات آہستہ آہستہ سامنے آئیں گے۔ پاکستان میں ماضی میں بھی ایسے واقعات پیش آ چکے ہیں تاہم ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ یوں کسی غیر ملکی شہری کو قتل کیا گیا ہو۔ مغربی اور یورپی یونین ممالک میں اس واقعہ کے حوالے سے انتہائی تشویش کا اظہار کیا گیا۔ دنیا بھر میں پاکستان کے حوالے سے انتہائی منفی تاثر گیا۔ تشدد اور انتہا پسندی پر مبنی واقعات سے نہ صرف پاکستان کی ساکھ متاثر ہوتی ہے بلکہ دنیا بھر میں مقیم اوورسیز پاکستانیوں پر بھی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ان کو تنقیدی سوالات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس واقعہ کے فوری بعد صدر عارف علوی، وزیر اعظم عمران خان، آرمی چیف قمر جاوید باجوہ، وزیر اعلی پنجاب عثمان بزدار کے ٹھوس اقدامات اور واضح سخت موقف کے علاوہ اپوزیشن رہنماؤں میاں شہباز شریف کی جانب سے مذمتی بیانات سامنے آئے، عالمی سطح پر ان کو بھی غور سے دیکھا اور سنا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ کئی ایک سوالات اٹھتے نظر آئے، عالمی سطح پر ہماری بعض جماعتوں کے متعلق یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ ان کے مذہبی شدت پسندوں کے ساتھ قریبی تعلقات ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں شدت پسندی کی اس فضا کو پروان چڑھانے کا ذمہ دار وہ انہی سیاسی جماعتوں کو قرار دیتے ہیں۔ فنانشل ایکشن ٹاسک فورس (ایف اے ٹی ایف) کے اجلاسوں میں بھی یہی الزامات زیر بحث رہے ہیں جس کے باعث پاکستان فیٹف کی گرے لسٹ میں ہے کیونکہ ان عناصر کے خلاف کارروائی میں ہماری حکومتیں ہمیشہ ہی تذبذب کا شکار رہی ہیں۔

پاکستان گزشتہ دو عشروں کے دوران انتہا پسندی اور دہشت گردی کیخلاف 70 ہزار سے زائد جانوں کا نذرانہ پیش کر چکا ہے اور اربوں ڈالر کا معاشی نقصان اِس کے سوا ہے۔ آج ہم کوڑی کوڑی کے محتاج ہو چکے

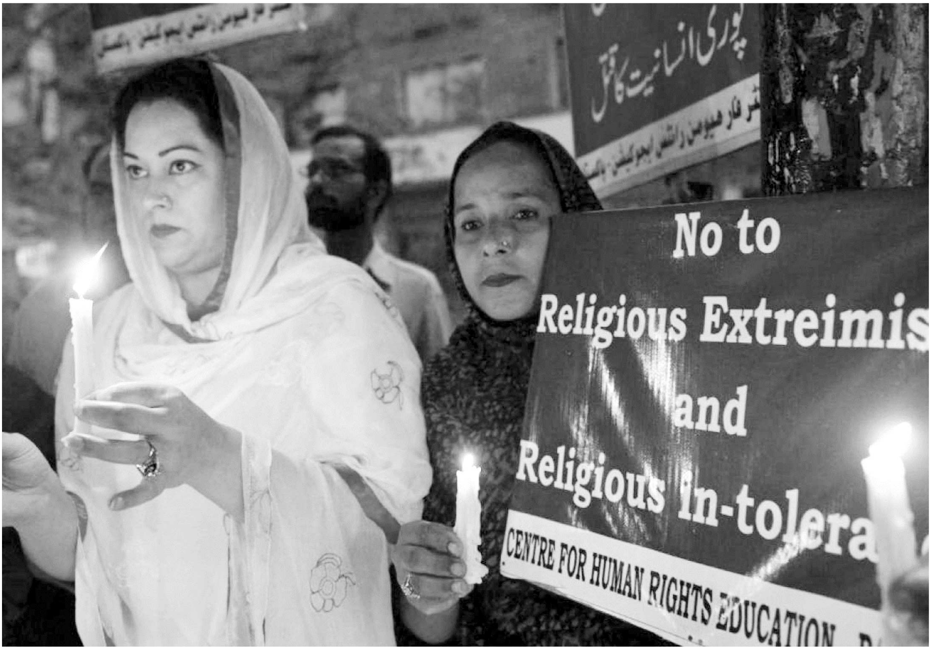
ہیں، اپنا سب کچھ آئی ایم ایف کے پاس گروی رکھ کر گزارا کیا جا رہا ہے۔ سیالکوٹ کا واقعہ دل خراش اور دل دہلا دینے والا ہے، آج تک پاکستان میں اٹھنے والی ہر شدت پسند تحریک اپنے مقاصد کے لیے مذہب کا نام استعمال کرتی چلی آ رہی ہے تاکہ اکثریت کو اپنی جانب راغب کیا جا سکے۔ یہاں تک کہ بیرونی طاقتیں بھی پاکستان میں اپنے مقاصد اور اہداف کے لیے مذہب ہی کو حربے کے طور پر استعمال کرتی ہیں اور ریاست و عوام کے خلاف برسر پیکار قوتوں کی مالی سرپرستی بھی مذہب کے نام پر ہی کی جاتی ہے۔

آج ہمارا ایسا کوئی قومی ادارہ نہیں بچا جہاں شدت پسندی کسی نہ کسی شکل میں موجود نہ ہو۔ اب شدت پسندی کا یہ زہر ہمارے قومی وجود کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ شدت پسند کم و بیش دنیا کے ہر معاشرے، مذہب اور تہذیب میں پائے جاتے ہیں، ان کی تعداد مٹھی بھر اور پورے معاشرے کے مقابلے میں انتہائی کم ہوتی ہے، تشویش ناک صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ شدت پسند عناصر ریاست اور نظام پر اثر انداز ہو کر پورے معاشرے کو یرغمال بنا لیں اور معاشرے میں اپنے وجود سے متعلق خوف اور دہشت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ پاکستان گزشتہ چند دہائیوں سے اسی طرح کی صورتحال سے دوچار ہے کہ یہاں شدت پسندی نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور وہ ریاست اور اس کے نظام کو چیلنج کر رہی ہے۔ آج ہماری بقا صرف اس میں ہے کہ ہمیں شدت پسندی کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہم عالمگیر معاشرے کا حصہ بن سکیں اور جدید دنیا کے شانہ بشانہ چل سکیں۔

بدقسمتی سے اس شدت پسندی کے باعث ہم مسلمان دیگر اقوام سے پیچھے جاتے جا رہے ہیں، اس تنہائی کے سبب ہماری اپنی اصل شناخت گم ہو رہی ہے۔ ہم کو بحیثیت قوم اپنی ترجیحات کا درست تعین کرنا پڑے گا۔ ہم اگر چاہتے ہیں کہ دنیا میں ہماری عزت ہو تو ہمیں اپنی ترجیحات کا از سر نو جائزہ لینا پڑے گا۔ مذہبی شدت پسندی کے خاتمے کے لیے بحیثیت قوم ہمیں عملی اقدامات کر کے ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ واریت نے ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

ماضی میں بحیثیت قوم ہم نے بار بار اس حوالے سے اپنی پالیسیاں تبدیل کی ہیں۔ ہر نئی حکومت نے اس حوالے سے قومی مفاد کی بجائے ذاتی مفاد کو ترجیح دی جس کی وجہ سے آج ہم اس مقام پر ہیں۔ ماضی میں بعض حکمرانوں نے اپنی پالیسیوں کی وجہ سے انتہا پسندی کو پروان چڑھایا اور بعض نے اعتدال پسندی کی

پالیسی اپنائی، اس کے بعد اب موجودہ حکومت کی پالیسیاں اور اقدامات ملک کو مذہبی انتہا پسندی کی جانب دھکیل رہے ہیں۔ ہماری بار بار اس حوالے سے پالیسیاں تبدیل کرنے کی وجہ سے آج ہم اس مقام پر ہیں۔ ہمیں انتہا پسندی یا اعتدال پسندی میں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا تاکہ آئندہ ایسے واقعات رونما نہ ہوں اور آئے روز عالمی سطح پر شرمندگی سے بچا جاسکے۔ انتہا پسندی اور دہشت گردی سے نمٹنے کے لئے قومی اتفاق رائے پر مبنی بیس نکاتی نیشنل ایکشن پلان سامنے لایا گیا جو یقینی طور پر کافی اہمیت کی حامل دستاویز تھی۔ ان نکات میں مجموعی طور پر محض انتظامی بنیادوں پر انتہا پسندی اور دہشت گردی سے نمٹنے کی حکمت عملی نہیں تھی، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر علمی اور فکری بنیادوں پر ذہن سازی اور نوجوان نسل میں سر سطح پر رواداری پر مبنی سوچ، فکر کو اجاگر کرنا فوقیت رکھتا تھا۔ خاص طور پر تعلیمی اداروں، نصاب، اساتذہ اور طالب علموں کو فوقیت دے کر اس میدان میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں پر زور دیا گیا تھا۔ پیغام پاکستان کی دستاویز جو تمام مذہبی مکاتب فکر کے درمیان انتہا پسندی کے خلاف اتفاق رائے پر مبنی ہے، وہ بھی ایک اہم پیش رفت ہے۔ اسی طرح رائے عامہ کی تشکیل میں میڈیا کے کردار کی اہمیت کے پیش نظر میڈیا، سوشل میڈیا کو بھی بنیاد بنا کر



اصلاحات پر زور دیا گیا تھا تا کہ ہم نئی نسل میں برداشت اور تحمل کا کلچر پیدا کر سکیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری سیاست میں موجودہ غیر یقینی کیفیت، عدم سیاسی، سماجی اور معاشی استحکام، محاذ آرائی، الزام تراشی اور ایک دوسرے کو قبول نہ کرنے کی روش نے نیشنل ایکشن پلان پر عملدرآمد کے تناظر میں وہ کچھ نہیں کیا جو قومی ضرورت کے زمرے میں آتا تھا۔ اصولی طور پر اس انتہا پسندی سے نمٹنے کے لئے سیاسی حکومتوں اور حزب اختلاف کی جماعتوں کو ایک بڑی قیادت کے طور پر ان معاملات میں برتری حاصل کرنی تھی، جو یقیناً ایک مضبوط سیاسی کمٹمنٹ اور مربوط نگرانی کے نظام کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ اس لئے اگر آج جو انتہا پسندی جیسا مرض موجود ہے اور اس میں ہم مسئلہ کے حل کی جانب نہیں بڑھ رہے تو اس میں ریاستی اور حکومتی تضاد کا پہلو بھی نمایاں ہے جو ہمیں مطلوبہ نتائج دینے کے بجائے نئی نسل کو فکری بنیادوں پر مزید الجھا رہا ہے۔

ماضی میں ہم یہ دلیل دیتے تھے کہ مذہبی انتہا پسندی دینی مدارس تک محدود ہے اور یہ مدارس انتہا پسندی کو بڑھانے میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ لیکن اب یہ مسئلہ محض دینی مدارس تک محدود نہیں رہا بلکہ ہمارے دیگر تعلیمی ادارے بھی اس کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ حالیہ کچھ برسوں میں انتہا پسندی اور دہشت گردی جیسے



معاملات میں جو کردار سامنے آئے ہیں ان میں پہلے نمبر پر زیادہ نوجوان نسل ہے اور دوئم ان کا تعلق اعلیٰ تعلیمی اداروں سے ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ پڑھی لکھی نسل بھی اس مرض کا حصہ بن گئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ نئی نسل میں جو انتہا پسندی بڑھ رہی ہے اس کی درست انداز میں تشخیص اور ادراک کے بعد ہم نے کیا حکمت عملی اختیار کرنی ہے جو ہمیں فی الوقت درکار ہے۔ یقینی طور پر جواب میں ہمیں بہت سے خلا یا مسائل نظر آتے ہیں، کیونکہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ہم ان انتہا پسندوں کے معاملات میں یکسو ہونے کے بجائے منقسم نظر آتے ہیں۔ ہم اس کو محض مذہبی مسئلہ سمجھ کر نمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں، جبکہ یہ مسئلہ مجموعی طور پر ریاستی ،حکومتی نظام ،طرز حکمرانی ،فیصلہ سازی اور نئی نسل میں موجود محرومی کی سیاست سے بھی جڑا ہوا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ جو انتہا پسندی موجود ہے یا بڑھ رہی ہے اس سے نمٹنے کے لئے ہمیں کیا کچھ درکار ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب ہم اجتماعیت پر مبنی اتفاق رائے اور فیصلے کو اہمیت دیں گے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ داخلی اور خارجی سطح پر کچھ عناصر ایسے موجود ہیں جو نئی نسل کو بغاوت، انتہا پسندی، انتشار اور شدت پسندی پر اکسا رہے ہیں، وہ یقیناً سچ ہوگا۔ کیونکہ ہمارے دشمن چاہے وہ ملک کے اندر ہیں یا



باہر، ہماری نوجوان نسل کو بنیاد بنا کر معاشرے میں فوج، حکومت، مذہب، ریاست اور اداروں میں ایک ایسی تقسیم پیدا کرنے کا ایجنڈا رکھتے ہیں جو ہمیں داخلی سطح پر کمزور کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ یہ جو داخلی اور خارجی عوامل ہیں چاہے ان کا تعلق انفرادی ہو یا ادارہ جاتی سطح پر، اس سے نمٹنے کے لئے بھی ہمیں ایک مربوط منصفانہ اور شفافیت پر مبنی جوابدہی ، احتساب اور نگرانی کا ایسا نظام درکار ہے جو ہمیں ان عناصر کی نشاندہی کرنے اور انتہا پسندی کو ختم کرنے میں معاوثابت ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جو بھی داخلی یا خارجی عناصر ہماری نئی نسل کو بنیاد بنا کر ہمیں کمزور کرنے اور انتہا پسندی پھیلانے کا ایجنڈا رکھتے ہیں ان کو طاقت بھی ہمارا کمزور داخلی نظام دے رہا ہے۔ کیونکہ داخلی سطح پر ہماری کمزوری ان قوتوں کو طاقتور بنا رہی ہے جو ہمیں کمزور کرنے کا ایجنڈا رکھتے ہیں۔ ہمارا حکمرانی کا نظام نئی نسل میں بغاوت، غصہ، نفرت اور محرومی کی سیاست کو طاقت فراہم کر کے ریاست اور نوجوان نسل کے درمیان ایک بڑی تفریق اور خلا پیدا کر رہا ہے۔ اس لئے مسئلہ یہ نہیں کہ ہم سارا غصہ نئی نسل پر نکالیں کہ وہ انتہا پسند بنتی جا رہی ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ ان محرکات کو سمجھ کر ایسی مئثر حکمت عملی کی طرف بڑھنا ہے جو نئی نسل کو انتہا پسندی سے باہر نکالے۔

نئی نسل کی بات کی جاتی ہے تو یہ محض پڑھی لکھی نسل یا لڑکوں تک محدود نہیں بلکہ اس میں وہ نسل بھی شامل ہے یا لڑ جو پڑھ نہیں سکی، یا جن کا تعلق دیہات سے ہے یا جو لڑکیاں ہیں یا جو معذور افراد ہیں، سب کو بنیاد بنا کر معاملات کو آگے بڑھانا ہوگا اور سب کے لئے مختلف حکمت عملیاں درکار ہیں۔ اسی طرح سوشل میڈیا ایک بڑی طاقت کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس پر نئی نسل کو آگاہ کرنا، اس سے متعلق قوانین سے روشناس کروانا ہے مزید یہ کہ کس طرح سے نئی نسل اس میڈیا کو طاقت بنا کر دو کام کرے۔ اول وہ اس سوشل میڈیا کو طاقت بنا کر سیاسی اور سماجی بنیادوں پر فکری اور علمی مباحث پیدا کریں اور دوئم علمی اور فکری بنیادوں پر انتہا پسندی پر مبنی مباحث کو چیلنج کرتے ہوئے ایک متبادل بیانیہ سامنے لائیں جو نئی نسل میں تحمل، برداشت اور رواداری پر مبنی سماج کی تشکیل میں معاون ثابت ہو۔ اسی طرح مدارس کے نصاب میں تبدیلی اور بالخصوص فرقہ وارانہ سوچ اور فکر کو چیلنج کر کے سب ہیں باہمی احترام کا رشتہ پیدا کرنا ہوگا۔

اسی طرح یہ سمجھنا ہوگا کہ اگر ہم نے نئی نسل کو انتہا پسندی سے باہر نکالنا ہے تو اس کا علاج ایک منصفانہ، شفاف اور برابری کی بنیاد پر چلنے والے جمہوری نظام سے جڑا ہے ایسا نظام جو لوگوں کے بنیادی حقوق کی ضمانت کا

سبب بن سکے۔یہ تصور کہ ہم نئی نسل کو محروم رکھ کر انتہا پسندی سے نمٹ سکیں گے، غلط ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی مجموعی سیاست اور اس کے فیصلوں کو بدلنا ہوگا۔ نئی نسل کو مثبت سرگرمیوں میں شامل کر کے تعلیمی اداروں، گھروں، محلوں اور کمیونٹی کی سطح پر زیادہ سے زیادہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے غیر نصابی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہوگا۔ غیر نصابی سرگرمیوں کے لئے وسائل کو مختص کرنا، کھیلوں کے میدان جن تک ان سب کی آسانی سے رسائی ہو اور کلچرل بنیادوں پر سرگرمیوں کی بنیاد کو طاقت دینی ہوگی۔ ہمیں نئی نسل میں ایک ایسا اتفاق رائے پیدا کرنا ہوگا کہ وہ مختلف سوچ ،فکر، مذہب، رنگ، نسل اور زبان کے باوجود اکٹھے رہ سکیں اور مل کر ملکی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں اس سب کچھ کے بعد ہی انتہا پسندی سے نمٹا جا سکتا ہے۔

یہ سمجھنا ہوگا کہ نیا بیانیہ کسی سیاسی تنہائی میں نہیں ہوگا۔ بیانیہ کی تلاش اور یکسو ہونے کا مقصد یہ ہے کہ تمام فریقوں کو سمجھنا ہوگا کہ انتہا پسندی سے نمٹنا ریاستی استحکام کی کنجی ہے۔ ہمیں ماضی کے بیانیے اور اس پر مبنی تضادات سے باہر نکل کر ایک ایسی سوچ اور فکر کو عام کرنا ہوگا جو معاشرے میں ایک دوسرے کو قبول کرنے میں معاون ثابت ہو۔ اس میں تعلیم اور اس سے جڑے تعلیمی اداروں، جامعات کو فوقیت دے کر نئی نسل کو اس نئے بیانیے سے جوڑ کر ایسے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو سفیر بنانا ہوگا جو خود آگے بڑھ کر اس بحث کو خود بھی سمجھیں اور دوسروں کو بھی سمجھائیں کہ ہمیں اس شدت پسندی کا مقابلہ کرنا ہے جو ہماری ریاستی ضرورت کے زمرے میں آتا ہے۔ شدت پسند کم و بیش دنیا کے ہر معاشرے، مذہب اور تہذیب میں پائے جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد مٹھی بھر اور پورے معاشرے کے مقابلے میں انتہائی کم ہوتی ہے۔ وہ اپنے اصولوں پر زندگی بسر کرتے رہتے ہیں اور اپنی درسگاہوں تک ہی محدود رہتے ہیں۔ اس کی مثالیں ہمیں آج کے ترقی یافتہ یورپ میں بھی مل جائیں گی کہ جہاں کچھ لوگ سیکولر معاشروں میں جہاں شخصی آزادی اپنی انتہا پر ہے، وہاں بھی سختی سے اپنے شدت پسندانہ خیالات پر کاربند ہیں۔ ہاں وہ ریاست اور نظام سے متصادم نہیں بلکہ اپنے مذہبی مقامات تک ہی محدود ہیں۔ تشویش ناک صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ شدت پسند عناصر ریاست اور نظام پر اثر انداز ہو کر پورے معاشرے کو یرغمال بنالیں اور معاشرے میں اپنے وجود سے متعلق ایک خوف اور دہشت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

پاکستان گزشتہ چند دہائیوں سے اسی طرح کی صورتحال سے دوچار دکھائی دیتا ہے کہ یہاں شدت پسندی نے

پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور وہ ریاست اور اس کے نظام کو چیلنج کر رہی ہے۔

آیئے پاکستان میں اس مسئلے کے عوامل، اسباب اور پس منظر کا کھوج لگائیں تاکہ کسی ایسے حل کی طرف بڑھا جائے جس سے پاکستان میں شدت پسندی کے بڑھتے ہوئے طوفان پر قابو پایا جا سکے۔ ہمارا یہ خطہ مذہبی رواداری کی ایک پوری تاریخ رکھتا ہے اور یہ سماج صدیوں سے کسی مذہبی و مسلکی تفریق کے بغیر ایک ساتھ رہتا چلا آیا ہے۔ موریہ خاندان کے تیسرے فرمانروا مہاراجہ اشوک اور مغلیہ سلطنت کے بھی تیسرے ہی فرمانروا شہنشاہ اکبر کا نام اس حوالے سے تاریخ نے خصوصی طور پر محفوظ رکھا ہے کہ انہوں نے مذہبی رواداری کی خصوصی مثالیں قائم کیں، لیکن بعد کے زمانے میں آخر وہ کون سے اسباب تھے کہ یہ خطہ، خصوصا پاکستان، اپنے شدت پسندانہ تشخص کی وجہ سے دنیا میں جانا جانے لگا۔ ہم اپنے دائرے کو محدود رکھتے ہوئے قیام پاکستان کے وقت سے ان اسباب و عوامل کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے جو پاکستان میں شدت پسندی کے فروغ کا باعث بنے۔ یہاں صدیوں سے موجود مذہبی رواداری کی روایت اس خطے کی تقسیم کی وجہ سے بھی متاثر ہوئی اور وہ روایت اس وقت مزید کمزور ہوئی جب مذہب کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ تقسیم سے قبل ہندوستان میں مذہب کے سیاسی استعمال سے شدت پسند طبقے مضبوط ہونا شروع ہوئے اور انہوں نے تقسیم کا جواز بھی مذہبی اختلافات میں ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

قومی اور سیکولر ریاست کے تخیل کے مقابلے میں مذہبی حکومت کے تصور نے اکثریت کو اپنے سحر میں جکڑ لیا اور یوں آج تک پاکستان میں اٹھنے والی ہر شدت پسند تحریک اپنے مقاصد کے لیے مذہب کا نام استعمال کرتی ہے تاکہ اکثریت کو اپنی جانب راغب کیا جا سکے۔ یہاں تک کہ بیرونی طاقتیں بھی پاکستان میں اپنے مقاصد اور اہداف کے لیے مذہب ہی کو آلے کے طور پر استعمال کرتی ہیں، اور ریاست و عوام کے خلاف برسرپیکار قوتوں کی مالی سرپرستی بھی مذہب کے نام پر ہی کی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں ایک پوری معیشت وجود میں آ چکی ہے۔ اب یہ جنگ محض نظریاتی دائروں کی جنگ نہیں، بلکہ مفادات اور اپنی اپنی بقا کی جنگ بن چکی ہے جس کی اتحادی اور مدمقابل قوتیں قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر موجود ہیں۔ دکسی معاشرے کی تعلیمی پالیسی اور اس کو بروئے کار لانے والے اساتذہ نئی نسل کی ذہن سازی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ ہم پاکستان میں پہلے دن سے ہی کوئی قومی اور انسان دوست تعلیمی پالیسی بنانے سے قاصر رہے ہیں۔

ہمارے ہاں بیک وقت کئی طرح کے نصاب تعلیم ایک ہی طرح کے نتائج پیدا کرتے رہے ہیں۔ ہمارے اساتذہ اس تعلیمی پالیسی کی چھتری تلے مستقبل سے زیادہ ماضی کو زیادہ زیر بحث لاتے رہے، اور ہندو مسلم اختلافات، فرقہ وارانہ تعصّبات اور دنیا پر حکومت کرنے کے خواب نے ایسی جنگجویانہ نفسیات کو جنم دیا جس نے معاشرے میں موجود شدت پسند عناصر کے حق میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہمارے حکمران اور ریاست گزشتہ کئی دہائیوں سے بہت جارحانہ رہے ہیں۔ اس تعلیمی پالیسی کے زیر اثر تیار ہونے والی نسل کو وہ بطور ایندھن استعمال کرتے رہے۔ یوں پاکستان میں شدت پسندی کی فصل پکتی رہی اور اس سے وابستہ عناصر کو بڑھاوا ملتا رہا۔ تنگ نظری، اپنے مذہبی حریفوں سے نفرت، عدم برداشت اور جارحیت ہمارے مزاج کا حصہ بنتی رہی اور ہم دنیا سے کٹتے کٹتے اپنے خول میں بند ہوتے چلے گئے۔ آج بھی پاکستان کا نظامِ تعلیم ایسا کوئی کردار ادا کرنے میں ناکام ہے جس سے عوام میں قرار واقعی سماجی شعور اور انسانی رویے فروغ پا سکیں اور ہم تعصّبات کی تنہائی سے نکل کر عالمگیر معاشرے کا باوقار حصہ بن سکیں۔ آج بھی ہمارا نصاب تعلیم رواداری، انسان دوستی اور مسلمہ انسانی اقدار پر خاموش ہے اور ہم خطے میں امن، سلامتی اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنے میں بری طرح ناکام ہیں۔ آج بھی ہمارے نصاب کے مضامین اپنی کمزوریوں کو



زیر بحث لانے کے بجائے غیر ضروری مواد سے اٹے پڑے ہیں۔
ان سے زیادہ ضروری تھا کہ ہمارے قومی نصاب تعلیم میں نوجوانوں کو یہ پڑھایا جاتا کہ ہم ایک علیحدہ مملکت قائم کرنے کے باوجود غربت، جہالت مافیاز کے راج، وڈیرہ شاہی اور جاگیردارانہ نظام کو ختم کیوں نہ کر سکے ،ہم آج جدید دنیا کے ساتھ چلنے کے قومی تقاضے کیسے پورے کر سکتے ہیں، ترقی یافتہ معاشروں کی جدید صنعت وحرفت، سائنسی علوم اور مہارتیں اپنے ہاں کیسے منتقل کی جا سکتی ہیں، دیگر ممالک نے سماجی انصاف کے حصول اور معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے کے لیے کیا کیا تجربات کیے ہیں اور ہم ان سے کیسے استفادہ کر سکتے ہیں۔لیکن ہم اپنے نصاب تعلیم کے ذریعے تنگ نظری کا بیج بوتے رہے، جس کا نتیجہ بہر حال تنگ نظری کی فصل کی صورت میں ہی نکلنا تھا۔آج ہمارا ایسا کوئی قومی ادارہ نہیں بچا جہاں شدت پسندی کسی نہ کسی شکل میں موجود نہ ہو۔اب شدت پسندی کا یہ زہر ہمارے قومی وجود کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ پاکستانی تاریخ کا انتہائی دردانگیز باب وہ ہے جب پاکستانی سوسائٹی اوندھے منہ شدت پسندی کے اندھے کنوئیں میں جا گری۔ دو عالمی طاقتوں نے اپنی جنگ لڑنے کے لیے اس خطے کا انتخاب کیا اور دو ہاتھیوں کی لڑائی میں اس خطے کی برداشت اور روادارانہ روایات کو کچل کے رکھ دیا گیا۔ یہ جنگ یوں تو روس اور امریکا کی تھی، مگر اس





جنگ میں ہم ساجھے دار بن گئے اور ہمارے معاشرے میں موجود شدت پسندی کی تمام نمائندہ قوتیں جنرل ضیاالحق کی قیادت میں متحد ہوگئیں۔ یوں پورا ملک شدت پسندوں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ مقامی اور بین الاقوامی شدت پسندی کے پاکستان میں اس اجتماع نے مذہبی رواداری کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر اسے دفنا دیا۔ اس جنگ کا بیس کیمپ پاکستان ٹھہرا اور سی آئی اے جیسے بدنام زمانہ ادارے دہشت گردی کی عالمی منڈی سے مجاہدین بھرتی کر کے افغانستان میں روس کے خلاف فراہم کرتے رہے۔ اس عمل میں دنیا بھر کی شدت پسند قوتوں نے دامے، درمے، سخنے مدد فراہم کی۔ امریکا اور اس کے کچھ حلیف ممالک اس میں بہت سرگرم رہے۔ فاٹا اور آزاد قبائل جن کو شاید اسی مقصد کے لیے ابھی تک انگریز دور کے قوانین کے تحت چلا جارہا تھا، وہاں تربیتی مراکز تیار کیے گئے۔ یوں پاکستان میں شدت پسندی کا لاوا پکتا رہا جو بعد ازاں آتش فشاں کی صورت میں پھٹ پڑا۔

اس سارے تناظر میں ایک مخصوص ذہنیت نے انتہا پسند اور شدت پسند طبقے کو اپنے مقاصد کے حصول میں معاون سمجھتے ہوئے اہم ریاستی اور سیکیورٹی اداروں تک رسائی فراہم کر کے انہیں اپنا شریک کار بنالیا۔ شدت پسندوں اور ان سے ہمدردی رکھنے والوں پر ایوانوں کے دروازے وا ہونے کے نتیجے میں انتظامیہ، فوج، سول اور سیاسی جماعتوں سمیت ملک کے اہم ترین اداروں میں مذہبی شدت پسند اور انتہا پسند در آئے۔ یہاں وہی کھیل کھیلا گیا جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ ایک عالمی طاقت نے دوسری عالمی طاقت کے خلاف لڑنے کو مقدس فریضے کا نام دیا۔ کسی کو بندوق تھمانا تو آسان ہے لیکن اس سے واپس لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لرننگ (Learning) کے مقابلے میں ان لرننگ (Unlearning) زیادہ مشکل ہے، اور جب کوئی بیانیہ عقیدے کا حصہ بنا دیا جائے تو اسے یادداشتوں سے محو کروانا اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ فرد اسے اپنی زندگی کے اہم ترین مقصد اور مشن کے طور پر اپنا چکا ہوتا ہے۔

جب آپ کسی سے اس کا مقصد اور عقیدہ چھیننے کی کوشش کریں گے تو وہ آپ سے لڑے گا خواہ اسے آپ کے یا اپنے دشمن ہی سے کیوں نہ مدد لینی پڑے، اور ایسی صورتحال میں معاشرے میں موجود ہمدرد عناصر ان دیکھے انداز میں ان کی پشت پر آ جاتے ہیں۔ یہی کچھ پاکستان میں ہوا کہ شدت پسند عناصر کو معاشرے کی مختلف پرتوں سے تعاون حاصل ہوتا رہا اور قومی عمارت کی بنیادوں میں شدت پسندی کا پانی رستے رستے

ہمارے قومی وجود کی بنیاد میں کھوکھلی ہوگئیں۔ پاکستان میں شدت پسندی کے جڑ پکڑنے کی ایک بڑی وجہ اہل علم اور دانشوروں کی طرف سے بوجوہ اس کو فکری اور نظریاتی سطح پر بطور ایک علمی اور فکری چیلنج کے قبول نہ کرنا بھی ہے کیونکہ افغان جنگ کے دوران ایسے دانشوروں کی حوصلہ شکنی کی گئی جنہوں نے پاکستان کی مقتدرہ کی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔اس کے برعکس ابیق رسائل وجرائد جاری ہونے لگے جن کے سرورق کلاشنکوف، مشین گنوں اور جدید اسلحے کی تصویروں سے مزین ہوتے تھے۔ان رسالوں اور جرائد میں چھپنے والے مواد نے سسپنس میں جاسوسی رسائل کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔آج کے بعض مقبول کالم نگار جو آج دہشت گردی کے خلاف بڑی بڑی باتیں کرتے نہیں تھکتے، وہ بھی لنگرلنگوٹ کر اس ریاستی پالیسی کی حمایت کررہے تھے۔شدت پسندی کی اس فضا کو پرواں چڑھانے اور پاکستانی معاشرے کو انتہاپسندی کے جہنم میں دھکیلنے میں سیاسی جماعتوں نے بھی اپنا پورا پورا حصہ ڈالا، جو آج دہشتگردی کے خلاف سب سے بڑا کریڈٹ لینے کے لیے تیار رہتی ہیں۔شدت پسند عناصر کے خلاف کارروائی میں ہماری سیاسی اور نام نہاد جمہوری حکومتیں ہمیشہ ہی تذبذب کا شکار رہی ہیں کیونکہ کسی نہ کسی طرح ان کے مفادات اس طبقے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں، مثلاً ووٹ بینک اور اپنی مقبولیت برقرار رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ پاکستان میں شدت پسندی کے یہ بنیادی اسباب ہیں۔اس کے بعد معاشرے میں شدت پسندی کی بقا اور استحکام کے لیے بہت سے اسباب اپنے اثرات ونتائج کے ذریعے شدت پسندیکو سازگار ماحول فراہم کرتے رہتے ہیں۔ایسے اسباب کی ویسے ہی ہمارے جیسے معاشروں میں کبھی کمی نہیں رہی، مثلاً ناانصافی، معاشی محرومیاں، بے روزگاری، طبقاتی معاشرہ، طاقت کا جبر، ذات پات کا نظام، مذہبی گروہ بندی کا وجود، دہشت گردوں کے خلاف عدالتوں سے مثر فیصلوں کا نہ آنا وغیرہ وغیرہ۔ضرورت آج اس امر کی ہے کہ ہمیں شدت پسندی کو ختم کرنے کی ہر کوشش کا ساتھ دینا چاہیے تاکہ ہم عالمگیر معاشرے کا حصہ بن سکیں اور جدید دنیا کے شانہ بشانہ چل سکیں۔ بدقسمتی سے اس شدت پسندی کے باعث مسلمان معاشرے عام انسانی معاشروں سے پیچھے جاتے جارہے ہیں، اس تنہائی کے سبب ہماری اپنی اصل شناخت گم ہوتی چلی جارہی ہے۔مگر یہ راستہ اتنا آسان نہیں اور اس کے لیے سب سے پہلے تو چند مشکل فیصلے کرنے ہوں گے۔ان فیصلوں میں نصاب کو بہتر بنانا، قومی بیانیے کی تبدیلی، اور خارجہ پالیسی کو مکمل طور پر ملکی وقومی مفاد کے زیر تحت تعمیر کرنا ہے۔اگر یہ سب کچھ کیا جائے، تو ہی شدت پسندوں کے

خلاف جاری جنگ جیتی جاسکتی ہے۔ ورنہ یہ صرف دہشتگردی کے خلاف جنگ ہے، اور جب تک سماج میں گہرائیوں تک موجود منفی ذہنیت کو جڑ سے نہیں اکھاڑا جاتا، تب تک منفی ذہنیت کے ساتھ ہتھیار اٹھائے ہوئے چند ہزار افراد کو شکست مکمل فتح نہیں کہلا سکتی۔

نوٹ:۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم شدت پسندی کو کسی ایک ملک یا قوم کی میراث قرار نہیں دے سکتے، یہ کہیں بھی کسی بھی جگہ اپنے پنجے گاڑ سکتی ہے، فرق یہ ہے کہ ترقی یافتہ اقوام نے بتدریج قانون کی حکمرانی اور رواداری کو پروان چڑھایا اور آج ہمارے مقابلے میں وہ مہذب کہلانے کے حق دار ہیں، درج ذیل آرٹیکل اسی بات کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

وہ فلسفی جنھیں بائبل کا انگریزی ترجمہ کرنے پر قبر سے نکال کر سزا دی گئی

جب انھیں 15 ویں صدی کے آغاز میں موت کی سزا سنائی گئی تو جان وانگلف اگر زندہ ہوتے تو یہی سوچتے کہ شکر ہے میں 20 سال پہلے ہی مر چکا ہوں۔ تاہم اگر انھوں نے یہ سزا سن لی ہوتی تو ان کے ذہن میں یہ بات کبھی نہ آتی کہ ان کی وفات کے 20 سال بعد سزا پر عملدرآمد کے لیے ان کو قبر سے نکالا جائے گا، ان کی باقیات کو جلا دیا جائے گا اور ان کی راکھ وسطی انگلینڈ میں دریائے سوکھٹ میں پھینک دی جائے گی۔ بد قسمتی سے قرون وسطیٰ کے انگریزی فلسفی اور ماہر الہیات کے ساتھ بالکل ایسا ہی ہوا۔ انھیں بائبل کا لاطینی سے انگریزی میں پہلا مکمل ترجمہ کرنے کا اعزاز حاصل ہے، تاہم اس ترجمے کو چرچ کی جانب سے پابندی اور شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ ترجمہ جسے آج وائکلف بائبل کے نام سے جانا جاتا ہے دراصل جان وائلکلف کا چرچ کے معمول کے معاملات کے حوالے سے اٹھائے گئے سوالات میں سے ایک نمایاں سوال تھا۔ ایسے خیالات جنھوں نے اختلاف رائے کی تحریک کو متاثر کیا اور اصلاح یا انقلاب کی بنیاد رکھی۔ یاد رہے کہ ان کی موت کے ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے کے بعد مسیحیوں میں پروٹیسٹنٹ فرقہ ابھر کر سامنے آیا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی میں قرون وسطیٰ کے انگریزی کے پروفیسر این ہڈسن نے وائلکلف کے لیے وقف بی بی سی کے ایک پروگرام میں بات کرتے ہوئے بتایا کہ وہ سمجھتے تھے کہ 14 ویں صدی کے آخر میں موجود چرچ انجیل میں پائے جانے والے تصور کا صحیح معنوں میں عکاس نہیں تھا۔ ہڈسن کے مطابق وہ کسی بھی طرح سے بنیاد پرست نہیں تھے بلکہ وہ اپنے خیالات کو اس وقت کے حالات اور چرچ کے پاس موجود دولت کے

درمیان پائے جانے والے فرق کو سادہ الفاظ میں بیان کرتے تھے۔اسی شو میں انتھونی کینی ایک فلسفی اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے بالیول کالج کے سابق چانسلر نے بتایا کہ وائلکلف کا ابتدائی فلسفیانہ کام اور تعلیمات کسی بھی غیر روایتی سوچ کی عکاسی نہیں کرتے۔کینی بتاتے ہیں کہ وہ غیر معمولی طور پر حقیقت پسند تھے اور انھوں نے اس حقیقت پسندی سے سیاسی نتیجہ اخذ کرنا شروع کیا۔

کینی بتاتے ہیں کہ جان کے نقطہ نظر کے مطابق کائنات فرد سے زیادہ اہم ہے اور کسی بھی معاشرے کی مشترکہ حقیقت کسی فرد کی انفرادی خصوصیات سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔اس طرح ان کا رجحان حقیقت پسندی پر مبنی تھیوریٹیکل کمیونزم کی جانب بڑھنے لگا۔وانگلف نے اپنے خیالات پر مزید غور وفکر کرنا شروع کیا اور ان کے بارے میں ایسے وقت کے بارے میں لکھنا شروع کیا جب نہ صرف چرچ بلکہ پورے معاشرے پر سوال اٹھنے لگے تھے۔ناٹنگھم یونیورسٹی میں قرون وسطی کی تاریخ کے پروفیسر روب لوٹن نے بی بی سی کو بتایا کہ اس سب کا ایک پس منظر ہے۔اس دور میں پوپ کی رہائش گاہ کو فرانس منتقل کر دیا گیا تھا،جس نے خود چرچ کے اندر اختیارات کے بارے میں بہت سے سوالات اٹھائے تھے۔انھوں نے مزید کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ بلیک ڈیتھ کے بعد آنے والی تیز رفتار سماجی تبدیلی جس نے معاشرے کے روایتی طریقوں کو چیلنج کیا اور سوال اٹھایا کہ ان تبدیلیوں کا سامنا کرتے ہوئے کوئی ایک مسیحی کے طور پر کیسے کام کر سکتا ہے۔ایک اور حقیقت 100 سالہ جنگ تھی جس نے برطانیہ کو فرانس کے خلاف کھڑا کر دیا تھا اور گیلک سرزمین پر چرچ کی موجودگی چیلنج ہو چکی تھی۔جان کے لیے یہ بات سمجھنا مشکل تھی کہ برطانیہ کی بادشاہت اور امرا کو کیسے ایک ایسی اتھارٹی کی مالی مدد کر سکتے ہیں جو دشمن کے علاقے میں موجود ہے۔

وانگلف کی تحریروں نے چرچ کو ایک ادارے کے طور پر چیلنج کیا اور بائبل کو اعلی ترین اتھارٹی کے طور پر برقرار رکھنے کی مہم میں کردار ادا کیا۔وانگلف کے نظریہ کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اس نے اپنی تحریر انگریزی میں لکھی جس کی وجہ سے اس تک رسائی ممکن ہوگئی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے بارے میں بات کر سکیں۔اسی وجہ سے اس نے بائبل کا ترجمہ کرنے پر زور دیا تاکہ مسیحی برادری کے لیے اعلی ترین اختیار کے طور پر اس مقدس کتاب کی اہمیت کو تقویت ملے۔ماہرین کے مطابق والگلف بائبل کا

ترجمہ بالکل روایتی ہے اوراس میں کوئی اضافہ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ان کے نام سے منسوب ہے لیکن اس میں کہیں بھی ان کا نام نہیں آتا۔ این ہڈسن نے کہا کہ اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ ایک باہمی تعاون کے باعث ہی ممکن ہو پایا ہوگا۔ یہ ایک طویل اور سست عمل ہوگا کیونکہ اس وقت پرنٹنگ پریس ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ وہ کاپیاں جو والکلف کی موت کے کافی عرصے بعد 1384 میں اس کے نظریات کے پیروکاروں کے ذریعہ تیار اور تقسیم کی گئیں جنھوں نے لولرز کے نام سے ایک تحریک تشکیل دی۔ یہ خیالات ایک ایسے وقت میں انتہائی اہم تھے جب چرچ میں تین پوپ تھے اور یہ ایک غیر فعال ادارہ بنتا جارہا تھا۔ وائکلف کو پروٹسٹنٹ اصلاح کے پیش رو میں سے ایک کے طور پر مارننگ سٹار سمجھا جاتا ہے۔ تاہم جب چرچ نے سنہ 1414 میں کونسل آف کانسٹینس کے ذریعے اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی تو ایک ہنگامی سربراہی اجلاس کے ذریعے مسیحی برادری کو متحد کرنے کی کوشش کی گئی، تو پہلی قراردادوں میں سے ایک میں ان لوگوں پر تنقید کرنا تھا جنھوں نے چرچ کے اختیاروں پر سوال اٹھائے تھے۔ اگرچہ والکلف کے خلاف سزا پر عمل درآمد میں سنہ 1428 تک کا عرصہ لگا لیکن اس کی باقیات کو قبر سے نکالا گیا، نذرآتش کیا گیا اور ان کی راکھ کو دریا میں پھینک دیا گیا۔

انتہا پسندی کے خاتمے کے لئے متبادل بیانیے کی اشد ضرورت

پاکستان میں غالبا پہلی دفعہ مختلف مگر صاحب الرائے حلقوں میں یہ بحث چل نکلی ہے کہ انتہا پسندی اور دہشت گردی کے بارے میں قومی بیانیے پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ اکثر حلقوں کا متفقہ خیال ہے کہ جب تک قومی بیانیہ (مروجہ) بدلتے حالات کے تناظر میں تبدیل نہیں کیا جاتا، شدت پسندی کی کوکھ سے دہشت گردی جنم لیتی رہے گی اور تمام تر ریاستی اقدامات کے باوجود یہ ناسور کم تو ہوسکتا ہے مگر ختم کبھی نہیں ہوگا۔ کسی بھی مزاحمتی تحریک یا ریاست مخالف سرگرمی کی جڑیں کہیں نہ کہیں موجود ہوا کرتی ہیں۔ ہم لاکھ کہیں کہ اسلام امن کا مذہب ہے اور اسے زبردستی دوسروں پر اپنے اپنے افکار یا نظریات کے مطابق مسلط نہیں کیا جا سکتا مگر حقیقت تو یہی ہے کہ بعض دیگر مذاہب کیطرح اسلام کو اپنے اپنے بیانیے اور نظریات کے مطابق مختلف ادوار میں بعض قوتیں استعمال

کرتی آئی ہیں اور آج پاکستان سمیت متعدد دیگر ممالک اور معاشروں کو بھی ایسے ہی عناصر کے فکری بیانیے یا نظریات کے منفی نتائج اور اثرات کا سامنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ہی کی بنیاد پر پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔تاہم اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ جن لیڈروں نے پاکستان کے لئے ایک مربوط ریاستی نظام وضع کیا تھا، ان میں اکثر سیاسی شعور عالمی سیاست اور عوامی خواہشات کی دولت اور ادراک سے مالا مال تھے۔ ان لیڈروں کی تعلیمات تقاریر اور ابتدائی ریاستی اقدامات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قطعاً مشکل کام نہیں ہے کہ وہ ایک فلاحی اسلامی ریاست کے خواہاں تھے اور ان کی ریاستی ڈیزائننگ میں ایک ایسے پاکستان کا خاکہ بالکل نہیں تھا جہاں اپنے نظریات کو سیاسی یا ریاستی سطح پر دوسروں پر مسلط کرنے کا مقصد یا ارادہ موجود ہو۔دوسرے معاشروں کی طرح پاکستان کے اندر بھی اس تصور یا مذہبی وابستگی کی غلط تشریح کی گئی کہ پاکستان ایک تنگ نظر یا شدت پسند رویے یا نظریئے کے فروغ کے لئے قائم ہوا ہے۔اس تشریح کی تشہیر کے لئے ایسے بہت سے طاقتور مذہبی حلقے میدان میں کود پڑے جن کا معاشرے میں کافی اثر رسوخ تھا اور بعض کو ان مذہبی نظریاتی تحاریک کی مسلسل آشیرباد بھی حاصل رہی جن کی پشت پر یہ فلسفہ پوری قوت کے ساتھ موجود تھا کہ پاکستان میں شدت پسندی پر مشتمل ریاستی اور معاشرتی ڈھانچہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

اندرونی عوامل کے ساتھ ساتھ خارجی نظریات سے جڑے ایک نظریاتی اتحاد کی جڑیں ہمارے بعض حکمرانوں کی معاونت کے باعث گہری ہوتی گئیں کہ مجوزہ شدت پسندی پر قائم اس نظریاتی تصور یا خواہش نے بعد میں ایک باقاعدہ بیانیے کی شکل اختیار کرلی ہے اور اس کا نتیجہ نکلا کہ پاکستان اس کے باوجود ایک سخت گیر اسلامی ریاست کے طور پر متعارف ہونے لگا کہ عوام نے مذہبی جماعتوں کو کسی بھی الیکشن میں پانچ یا سات فیصد سے زیادہ ووٹ نہیں دیئے۔اگر ملک کے عوام واقعتاً ایک سخت گیر اسلامی پاکستان کے حامی ہوتے تو پارلیمانی تاریخ کا انڈیکس سیکولر اور جمہوریت پسند سیاسی قوتوں کے بجائے مذہبی جماعتوں کی ترجمانی کرتا نظر آرہا ہوتا۔تاہم عوام نے تمام انتخابات کے دوران مذہبیقوتوں کو مسترد کیا حالانکہ ہم جس شدت پسند بیا بیانیے کی بات کررہے ہیں، مذہبی جماعتوں کا طرز

عمل اس سے بالکل مختلف بلکہ بہتر رہا ہے۔ کیونکہ ان کو نہ چاہتے ہوئے بھی عوام کے رجحانات اور خواہشات کا تھوڑا بہت ادراک تھا۔

آج ہم مذہب اور ریاست کے اشتراک پر مشتمل جس بیانیے کا سامنا کر رہے ہیں، شواہد اور تجربات تو یہ بتاتے ہیں کہ اس کو کبھی بھی سیاسی قوتوں عوام اور اشرافیہ کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں رہی۔ چند ایک لیڈروں کی پالیسیوں کوششوں یا خواہشوں کو پورے ملک معاشرے یا ریاست کی پالیسی کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ المیہ یہ رہا ہے کہ اہل ریاست نے باہمی فاصلوں بدگمانیوں یا غیر سنجیدگی جیسے عوامل کے باعث اصل بیانیے کی اہمیت ترویج اور تشہیر پر کبھی توجہ نہیں دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اقلیت کی خواہشات پر مبنی ایک مبہم اور خطرناک بیانیے کو بوجوہ فروغ ملتا رہا اور ہم ایک خطرناک جنگ کا شکار ہوتے گئے۔ ریاست کی یہ ضرورت بھی ہوتی ہے اور مجبوری بھی، کہ وہ اجتماعی عوامی یا قومی سوچ یا خواہش پر مشتمل رویے اور پالیسیاں اپنائے کیونکہ عوام کی رائے اور مرضی کے بغیر نہ تو ریاست ترقی کر سکتی ہے اور نہ ہی کوئی مضبوط سیاسی نظام تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہ راستہ اپنایا گیا تاہم بعض قوتوں یا حلقوں کے بیانیے کو قومی رائے یا خواہش کا نام دیا گیا اور احتجاجی سوچ کو پس منظر میں ڈالنے یا رکھنے کی روش اپنائی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک مخصوص ذہنیت نے تشدد کے ذریعے نہ صرف معاشرے کو لپیٹ میں لئے رکھا بلکہ یہ ذہنیت ریاستی امور اور اذہان پر بھی اثر انداز ہونے لگی۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم ماضی کی غلطیوں کا رونا روتے ہیں مگر حال کے معاملات اور مستقبل پر کوئی توجہ نہیں دے رہے۔

تاریخی حقائق کے تناظر میں اگر مختصراً یہ کہا جائے کہ بحیثیت قوم پاکستانیوں کا مزاج ہمیشہ جمہوری اور سیاسی رہا ہے تو یہ غلط بالکل نہیں ہوگا۔ پاکستان کے اداروں کی بھی کوشش رہی ہے کہ اس کی معتدل شکل مضبوط ہو اور یہ ایک فلاحی اسلامی ریاست ہو۔ تاہم بعض قوتوں کے نظریات نے بوجوہ معاشرے اور ریاست کو شدت پسندی کی جانب مائل کرنے کی کوششیں جاری رکھیں اور جب یہ کوششیں عوام کے ایک گروہ میں مقبولیت حاصل کر چکیں تو ان قوتوں نے بندوق تشدد اور جبر کے ذریعے اپنے نظریات مسلط کرنے کا راستہ اپنا کر ریاست اور سوسائٹی دونوں کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا۔ شدت پسندی کے نظریات کی کوکھ سے جنم لینے والی جس دہشت گردی کا ہم کئی برسوں سے سامنا کر رہے ہیں، اس کے پیچھے یہی پس

منظر اور کوششیں کارفرما ہیں اور اس کوشش کے پیچھے اسی بیانیے کا ہاتھ ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ بعد از خرابی بسیار کے مصداق پاکستان کے مقتدر اور عوامی حلقے اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شدت پسندی اور انتہا پسندی کا خاتمہ کئے بغیر دہشت گردی کا راستہ روکنا مشکل ہے۔ اسی سوچ کے تناظر میں کوشش کی جا رہی ہے کہ دہشت گردی سے متعلق اقلیت کے مروجہ بیانیے کو تبدیل کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں تا کہ اس مرض کی تشخیص کے بعد اس کا مستقل علاج بھی ڈھونڈا جا سکے۔

نیشنل ایکشن پلان ایک ایسا قومی فیصلہ یا مسودہ ہے جس میں قومی اتفاق رائے سے اس بات کا عزم ظاہر کیا گیا ہے کہ بعض عملی اقدامات کے علاوہ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے فکری تبدیلیاں بھی لائی جائیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ عوام کو یہ پیغام بھی دیا جائے گا کہ شدت پسندی کے ذریعے اپنے نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنے کی تمام کوششوں کی سختی کے ساتھ حوصلہ شکنی کی جائے گی۔ اگر نیشنل ایکشن پلان کے 20 نکات کا جائزہ لیا جائے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زیادہ توجہ اس امر پر ہی دی گئی ہے کہ معاشرتی سیاسی اور ریاستی سطح پر مشترکہ کوششوں اور اقدامات کے ذریعے دہشت گردی کی وکالت کرنے والے نام نہاد مذہبی بیانیے کو تبدیل کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ریاستی رٹ کی بحالی اور قانون کی بحالی کے لئے طاقت کا استعمال بھی کیا جائے۔

درحقیقت نیشنل ایکشن پلان کے 20 میں سے چھ نکات ایسے ہیں جو کہ بالواسطہ یا بلا واسطہ بیانیے ہی سے متعلق ہیں۔ تاہم افسوسناک امر یہ ہے کہ معاشرے اہل ریاست میڈیا اور سول ادارہ جاتی نظام نے نیشنل ایکشن پلان پر عمل درآمد کا تمام کام فورسز پر چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ فورسز کا مینڈیٹ اور کام بالکل الگ نوعیت کا ہے اور انہوں نے قومی قیادت اور عوام کے فیصلوں کے مطابق اپنے اختیار اور مینڈیٹ کے اندر رہ کر فرائض انجام دینے ہوتے ہیں۔ اگر گزشتہ دو سال کے واقعات پالیسیوں اور اقدامات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت یہ ہوتا ہے کہ فورسز نے اپنے حصے کا کافی کام تو کر دیا ہے تاہم معاشرے کے دیگر سٹیک ہولڈرز اپنے اپنے حصے کا کردار ادا کرنے ہیں یا تو ناکام رہے ہیں یا جو کام انہوں نے کیا ہوا ہے وہ ناکافی یا نامکمل ہے۔ ماہرین کے مطابق جو لوگ شدت پسندی کی جانب مائل ہیں کیا ہو رہے ہیں ان کو اسلام جہاد یا قتال کا صحیح مفہوم سمجھانا کسی بھی ادارے یا گروہ کا کام نہیں ہے بلکہ اس کے لئے اجتماعی کوشش ناگزیر

ہے۔اس مقصد کے حصول کی سب سے بڑی ذمہ داری علما پر عائد ہوتی ہے کیونکہ مذکورہ بیانیے کا بنیادی تعلق مذہب یا اس کے ایک جزو سے ہے جس کی غلط یا نامکمل تشریح کی جارہی ہے۔تاہم افسوس کی بات یہ ہے کہ علما یا دیگر دینی حلقے خوف مصلحت یا کسی اور وجہ سے اپنا یہ فرض سرانجام دینے میں ناکام رہے ہیں حالانکہ متعدد اسلامی حلقے یا اکابرین متعدد بار اس بیانیے کے نتائج کا خود بھی شکار ہوتے آئے ہیں۔

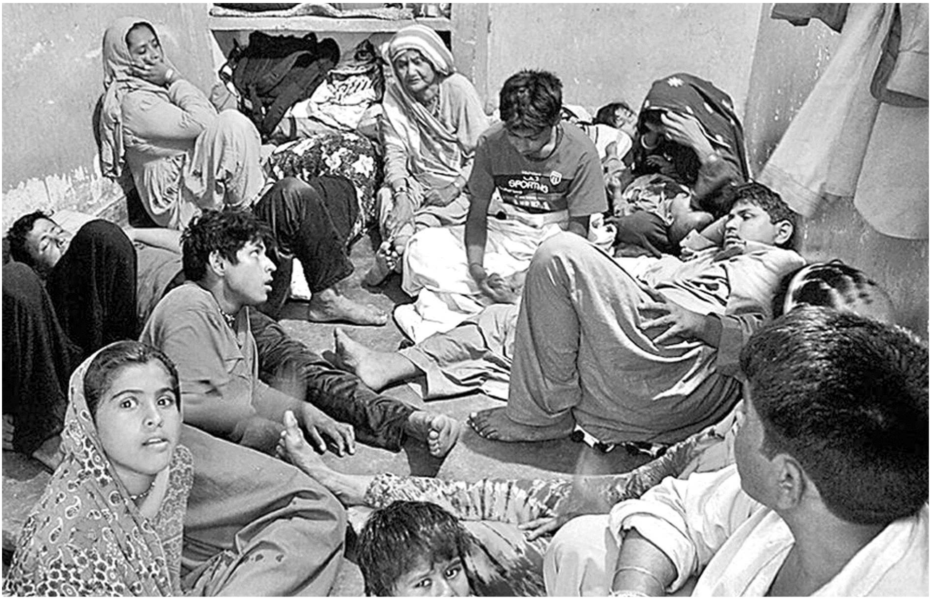
ان مذہبی حلقوں کو اچھی طرح علم ہے کہ نامکمل یا جانبدارانہ مروجہ بیانیے کے اثرات اور نتائج کتنے منفی اور خطرناک ہیں۔اس کے باوجود وہ درست اور درکار بیانیے کی تشریح اور تشہیر کے اپنے فریضے سے غافل



ہیں۔حد تو یہ ہے کہ یہ حلقے اکثر مواقع پر مناسب اور درکار ریاستی اقدامات پر تعاون کے بجائے مزاحمت کا راستہ اختیار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔اس ضمن میں مدارس کے نصاب یا طریقہ کار میں اصلاحات کی حکومتی کوششوں کی مثال دی جاسکتی ہے۔جس کے دوران مذہبی حلقے ریاست کے مدمقابل کھڑے ہونے میں دیر نہیں لگاتے حالانکہ ان کو اچھی طرح علم ہے کہ ریاست کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں اور عوام کے تحفظ کے لئے ریاست کو کس حد تک جانا چاہئے۔یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ریاست کسی کو بھی یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ اس کی رٹ کو چیلنج کیا جائے یا بندوق کے زور پر اپنے نظریات دوسروں

پر ٹھونسے جائیں۔ اس بات کا بھی سب کو علم ہے کہ اگر ریاست ایسے معاملات میں اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر پاتی تو اس کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے اور عوام کا اس پر اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ اس کے باوجود اگر علما یا مذہبی حلقے اپنے فرائض سے غافل ہیں تو یہ ایک المیہ ہی ہے۔

قومی بیانیے کی تشریح یا تشہیر میں سیاسی قوتوں کا بھی بنیادی کردار ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ یہ عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ مذہبی حلقوں کے مقابلے میں اکثر سیاسی جماعتوں کا کردار کافی بہتر ہے تاہم اس کو بھی درپیش چیلنجز کے تناظر میں اطمینان بخش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ محض کسی ایجنڈے یا



فیصلے کی تائید سے نتائج برآمد نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے لئے کھلے ذہن کے ساتھ میدانِ عمل میں آنا پڑتا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ مذہبی قوتوں اور فورسز کے ساتھ ساتھ مین سٹریم سیاسی قوتیں بھی اپنا کردار ادا کریں۔ میڈیا اور سول سوسائٹی کا رول بھی انتہائی اہم ہے۔ اگرچہ ماضی کے مقابلے میں اب کی صورت حال نسبتاً بہتر اور مثبت ہے، تاہم رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے جن کوششوں کی ضرورت ہے وہ نظر نہیں آ رہیں۔

اس میں دو رائے ہیں ہی نہیں کہ اگر فورسز سول قیادت سیاسی جماعتیں مذہبی فورمز اور میڈیا جیسے ستون جینوین متبادل بیانیے کے معاملے پر فوکس کر کے ایک پیج پر آ جائیں تو نہ صرف یہ کہ ملک سے دہشت

گردی کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ شدت پسندی اور انتہا پسندی کی وہ جڑیں بھی ختم ہو جائیں گی جن سے وقتاً فوقتاً نئی فصلیں تیار ہو کر نکل آتی ہیں اور ہمیں ہر بار مختلف کارروائیوں کے ذریعے بڑے نقصان کے بعد ایک نئی فصل کو پھر سے کاٹنا پڑتا ہے۔ اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ محض فورسز کی کارروائیوں سے اس مسئلے کا حل نکل آئے گا تو یہ درست نہیں ہوگا۔ ماہرین اس ضمن میں درج ذیل تجاویز پیش کرتے ہیں۔

1- اس اہم قومی معاملے پر مذاکروں مباحث اور سیمینارز کے ذریعے اس بات کا عملی جائزہ لیا جائے کہ اس نوعیت کے بیانیے اور شدت پسندی اور دہشت گردی کا آپس میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

2- اس معاملے پر غور کیا جائے کہ اسلام جہاد اور ایک فلاحی ریاست کے بارے میں ہمارے ہاں جو تصورات اور نظریات موجود ہیں، آیا زمینی حقائق اور تاریخی تناظر میں وہ درست بھی ہیں یا نہیں۔



3- اس رویے پر نظر ثانی کی جائے کہ سیاسی مذہبی اور علمی حلقے واقعتاً اپنا کردار ادا کر بھی رہے ہیں یا نہیں۔ آیا دہشت گردی سے نمٹنا صرف ریاست اور فورسز کی ذمہ داری ہے یا معاشرے کو بھی آگے آنا پڑے گا۔

4- ان مراکز کو ڈھونڈ کر عوام کے سامنے رکھا جائے جہاں سے مخصوص حالات کے باعث شدت پسندی پر نظریات متعارف ہوئے اور اس رویے نے عملی شکل پاکستان یا افغانستان میں اختیار کر لی۔

5- ان عناصر کا ریاستی سطح پر نتائج کی پروا کئے بغیر سخت محاسبہ کیا جائے جو کہ شدت پسندی کے تابع بیانیے

کا دفاع کر رہے ہیں یا اس کا حصہ دار بنے ہوئے ہیں۔ یہ بات بھی یقینی بنائی جائے کہ کسی خوف یا مصلحت کو رکاوٹ نہ بننے دیا جائے۔

6-کاؤنٹر ٹیررازم کے اقدامات کے ساتھ ساتھ کاؤنٹر نیریٹو کی کوششوں پر نہ صرف یہ کہ فوکس کیا جائے بلکہ اس مقصد کے لئے ریاستی سطح پر یورپی ممالک کی طرز پر ایک بجٹ بھی مختص کیا جائے تا کہ ایک مسلسل عمل اور مانیٹرنگ کے ذریعے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔

شدت پسندی کا علاج تلاش کرنا ہوگا:

پاکستان کا ایک بنیادی مسئلہ انتہا پسندی اور شدت پسندی پر مبنی رجحانات ہیں۔ یہ مسئلہ محض مذہبی ہی نہیں بلکہ سیاسی، لسانی، علاقائی اور فرقہ وارانہ انتہا پسندی سے بھی جڑا ہوا ہے۔ ہمیں مرض کی شدت کا تو اندازہ



ہے لیکن اس مرض کی درست تشخیص اور اس کے موثر علاج کرنے پر ہمیں کئی حوالوں سے داخلی تضادات، کمزور سیاسی کمٹمنٹ اور قومی عدم ترجیحات کا فقدان غالب نظر آتا ہے۔ اس مسئلہ نے ہمارا مقدمہ محض داخلی محاذ پر ہی نہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر خارجی سطح پر بھی کمزور کر دیا ہے۔

ہم نے قومی سطح پر اس مسئلہ سے نمٹنے کے لیے کئی پالیسیاں اور قانون سازی سمیت انتظامی اقدامات کیے ہیں جن میں نیشنل سیکورٹی پالیسی، نیشنل ایکشن پلان، پیغام پاکستان، دختران پاکستان، سائبر پالیسی،

تعلیمی اور مدارس اصلاحات کی تشکیل نو کی ہے۔لیکن مجموعی طور پر ان پالیسیوں پر عملدر آمد کا نظام یا تو کمزور ہے یا واقعی ہماری داخلی تضادات کی سیاست کو نمایاں کرتا ہے۔

سانحہ سیالکوٹ کا واقعہ ہو یا خانیوال کے شہر تلمبہ کا واقعہ جہاں شدت پسند مذہبی عناصر یا ہجوم کا ایک بڑا دستہ خود ہی کا وکیل بن جاتا ہے اور خود ہی جج بن کر اپنی مرضی اور منشا کے مطابق فیصلہ کر کے ریاست کی رٹ اور قانون کی چیلنج کر کے پورے ریاستی نظام کو تماشا بناتا ہے۔توہین رسالت کے نام پر جو کچھ ہو رہا یہ محض دو واقعات نہیں بلکہ کئی برسوں سے اس کے تسلسل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ہم ہر بار ندامت کے ساتھ ہر سطح پر مذمت کرتے ہیں، واویلا مچاتے ہیں اور ریاستی وحکومتی سطح پر اس واقعہ کو آخری واقعہ قرار دیا جاتا ہے مگر ان واقعات کی روک تھام میں ریاست اور حکومت ناکام نظر آتی ہے۔

پاکستان کی بقا اقلیتوں کے تحفظ سے مشروط ہے

یہ منظر نامہ ظاہر کرتا ہے کہ تسلسل کے ساتھ اس ملک میں شدت پسندی بڑھ رہی ہے یا واقعی اس ملک میں شدت پسندی کی گہری علامات ہیں جن کا علاج تلاش کرنا ہوگا۔ ہمارا المیہ یہ ہی کہ اس میں محض ریاستیا حکومت کی کمزوری کا پہلو ہی نہیں بلکہ مجموعی طور پر سیاسی وسماجی نظام، مذہبی اور سیاسی قیادت، علمائے کرام، میڈیا، دانشور، شاعر، ادیب، مصنف، استاد اور سماجی راہنما سب ہی ان واقعات میں برابر کے ذمہ دار ہیں۔

ایک منطق یہ دی جاتی ہے کہ لوگوں میں محرومی کی سیاست، وسائل کی کمی، سماجی، سیاسی اور قانونی عدم انصاف اور ریاستی کمزوری پر مبنی نظام ہی شدت پسندی کی اہم وجوہات ہیں۔لیکن محض ان نکات کو بنیاد بنا کر جو انتہا پسندی پر مبنی مذہبی رجحانات ہیں ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ ہم بطور سماج جس انداز میں معاشرے کی تعمیر نو یا تشکیل نو کر رہے ہیں یا جو عادات واطوار یا جو رویے وطرز عمل کو طاقت دے رہے ہیں وہی بڑا المیہ ہے۔

ہم مجموعی طور پر معاشرے کو یکجا کرنے کی بجائے معاشرے کی سیاسی، مذہبی، فرقہ واریت، لسانیت اور علاقائی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔اس تقسیم کا نتیجہ لوگوں میں ایک دوسرے کے بارے میں مختلف نوعیت کے تعصب، نفرت اور دشمنی کی بنیاد پر سامنے آ رہا ہے۔ ہمیہ بھول رہے ہیں کہ اس معاشرے میں مختلف مذاہب، فرقوں کے لوگ رہتے ہیں اور ہم اپنے مسائل یا اختلافات کو تشدد کے مقام

پر لے جاتے ہیں۔ اگر ہمیں کسی فریق کے اقدام سے شکایت ہیں اور کسی کی مذہبی سمیت کسی بھی واقع پر دل آزاری ہوئی ہے یا کسی کے مذہبی جذبات مجروح ہوئے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم آئین اور قانون کی مطابق قانونی راستہ اختیار کرنے کی بجائے خود سے انصاف کرنا چاہتے ہیں۔

بظاہر یہ لگتا ہے کہ ہم معاشرے کی تربیت کے عمل میں ناکام ثابت ہورہے ہیں۔ یہ ناکامی عملی طور پر گھر، خاندان، معاشرہ، تعلیمی وسماجی وسیاسی نظام کی ہے جو لوگوں کو مہذب اور ذمہ دار شہری بنانے میں اپنا کردار



ادا نہیں کرسکا۔ مذہبی سطح پر ہمارے علمائے کرام اور جماعتوں کا کردار زیادہ سوالیہ نشان کے طور پر سامنے آتا ہے۔ کیونکہ کردار سازی اور قومی تعمیر نو بظاہر ہماری سیاسی ترجیحات میں بہت پیچھے کھڑی نظر آتی ہے۔

بطور مسلمان اور انسان ہماری کئی ذمہ داریاں ہیں۔ ان ذمہ داریوں میں سماجی آداب اور انسانیت کی قدر چاہے ان کا تعلق آپ کی سوچ اور فکر سے مختلف ہی کیوں نہ ہو کرنی چاہیے۔ یہ جو ہمیں عجیب سا بخار چڑھ گیا ہے کہ ہم ہی اعلی ہیں اور باقی سارے خراب یا گناہ کار ہیں اس خبط سے باہر نکلنا ہوگا۔ ہم ضرور اپنی سوچ اور فکر پر قائم رہیں لیکن دوسروں کی سوچ اور فکر جو آپ سے مختلف اس کو احترام دینا اور اپنے

مزاج میں رواداری کو پیدا کرنا ہی ہمارا قومی درس کا حصہ ہونا چاہیے۔

عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ ہجوم کی کوئی نفسیات نہیں ہوتی اور ان کی کوئی پہچان بھی نہیں ہوتی۔ لیکنیہ تسلیم کریں یہ ہجوم کوئی اور نہیں ہم ہی لوگوں میں سے ہیں اور ان میں جو لوگ زیادہ اشتعال انگیز بیان میں نفرت کو پیدا کر کے ان میں اشتعال پیدا کرتے ہیں ان کی نشاندہی کرنا اور ان کو کیفر کردار یا جوابدہ بنانا ریاستی و معاشرتی ذمہ داری ہے۔ ایک بڑی بے حسییہ ہے کہ ہجوم میں اس طرح کے واقعات میں عام لوگ جو وہاں تماشا دیکھتے ہیں یا ویڈیوز بناتے ہیں ان کی مزاحمت نہ ہونا یا تو ان کے ڈرپوک ہونے یا خوف زدہ ہونے کی نشاندہی کرتی ہے یا یہ لوگ بھی کسی نہ کسی شکل میں اس کا حصہ دار بن کر ان ہی لوگوں کو طاقت فراہم کرتے ہیں جو شدت پسندی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اصل مسئلہ ان شدت پسند عناصر کو قانون کے کٹہرے میں لانا اور سزا نہ دینے کا عمل بھی ہے جو بلاوجہ ان شدت پسند عناصر کو تقویت دیتا ہے کہ وہ زیادہ طاقت ور اور ریاستی حکومت ان کے مقابلے میں زیادہ کمزور ہے۔ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہمارا مجموعی تعلیمی نظام جن میں مدارس کا نظام بھی شامل ہے تنقیدی زمرے میں آتا ہے۔ کیونکہ جو لوگ شدت پسندی کے مرتکب ہو رہے ہیں وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں اور بظاہر تعلیم کا ان کے طرز عمل پر کوئی بڑا مثبت اثر نہیں ہو رہا۔

ہمارا تعلیمی نظام تربیت کے نظام سے محروم نظر آتا ہے اور اس پر سونے پر سہاگہ کہ ہمارا میڈیا کا مجموعی نظام بھی لوگوں کی تعلیم و تربیت میں اپنا غیر معمولی کردار ادا نہیں کر سکا۔ شدت پسندی پر مبنی ذہن کی تشکیل کیسے ہوتی ہے اور کیسے ایک فرد یا ہجوم اس کو اپنے مزاج کا حصہ بناتا ہے اس کا سیاسی، سماجی اور نفسیاتی تجزیہ کرنا ہوگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو لوگ مذہبی شدت پسندی کا شکار ہوتے ہیں ان کے دل و دماغ میں کون عصبیت بھرتا ہے اور اس کا ایجنڈا کیا ہے۔ کیوں ہم معاملات کو قانون کی دائرہ کار میں حل کی بجائے طاقت اور تشدد کی بنیاد پر حل کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر ریاست، حکومت اور معاشرہ کا ان واقعات پر ردعمل محض ردعمل کی ہی سیاست سے جڑا ہوتا ہے۔ ان مسائل کے حل کے لیے لانگ ٹرم، مڈ ٹرم اور شارٹ ٹرم پالیسی، اہداف اور حکمت عملی سمیت عملدرآمد کے نظام کا فقدان بڑا چیلنج ہے۔ سیاسی و مذہبی جماعتوں کا ریاستی بیانیہ کمزور ہے اور یہ لوگ ان جذباتی

معاملات پر قوم کی راہنمائی کرنے کی بجائے اس کو سیاسی رنگ دے کر اپنے سیاسی فوائد کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

پولیس کا مجموعی نظام بھی سمجھوتوں یا ڈر اور خوف کا شکار نظر آتا ہے اور بعض اس طرح کے واقعات پر پولیس کی موجودگی پر ہونا اور ان کی مجرمانہ خاموشی بھی سنگین مسائل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس لیے اب وقت آ گیا ہے ہمیں اس مجموعی صورتحال پر سماجی و سیاسی نظام کا بڑے پیمانے پر پوسٹ مارٹم کرنا ہوگا۔ یہ مرض کینسر جیسے مرض کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کا علاج بطور معاشرہ ہم عملی طور پر ڈسپرین کی گولی سے کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔







یہ صورتحال غیر معمولی صورتحال کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کے لیے ہمیں غیر معمولی اقدامات درکار ہیں۔ یہ کام محض قانونی بنیاد یا انتظامی بنیادوں پر ہی ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے سماج کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ یہ کام محض تن تنہا ریاست یا حکومت نہیں کر سکتی بلکہ اس کے لیے معاشرے کے تمام ذمہ دار فریقین کو باہمی حکمت عملی سے شدت پسندی کا علاج تلاش کرنا اور عملدر آمد کرنا ہوگا۔ کیونکہ اگر ہم نے اس مرض کا فوری سد باب نہ کیا تو اس کی آگ ہمیں بطور معاشرہ ایک بڑی پیٹ میں لے گا جو زیادہ خطرہ ثابت ہوگا۔





آنسہ قراۃ العین تاج